میرا شوق میرا انتظار دیکھ

عنیزہ سیّد

میرا شوق میرا انتظار دیکھ

وہ بہت حیرت سے اپنے سامنے بیٹھی لڑکی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ یقیناً اس کو جانتا تھا۔ اتنے سالوں میں اس کی شکل، نین نقش بالکل نہیں بدلے تھے، ہاں اس کی عمر میں یقیناً اضافہ ہوا تھا۔ اس نے ابھی ابھی مسز ستار سے جو اس کی اور اس تقریب میں موجود ہر مہمان کی میزبان تھیں، سے اس کا نام پوچھا تھا۔ اس کا نام وہی تھا جو اس کے ذہن میں تھا۔ وہ ''نگار السحر'' تھی۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ بہت پہلے بچپن میں ہی جب وہ پہلی بار اس فیملی سے متعارف ہوا تھا، اس وقت بھی یہ نام اسے منفرد لگا تھا اور عجیب بھی۔ اس وقت وہ بہت چھوٹی تھی بالکل بچی۔ وہ اس سے عمر میں اتنی چھوٹی تھی کہ اس نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی سوائے اس کا نام سننے کے۔

اس کے بعد سالوں کی ملاقاتوں میں بھی یہ لڑکی کچھ زیادہ اس کی نظروں میں نہیں رہی تھی مگر اب جبکہ وہ اتنے سالوں بعد اس ملک میں آیا تھا اور جب سے آیا تھا اسے ماسوائے چند پرانے دوستوں اور بہت سی نئی شکلوں کے کوئی عزیز رشتے دار نہیں ملا تھا۔ اس کے سارے قریبی رشتے دار آہستہ آہستہ بیرون ملک شفٹ ہو چکے تھے۔

اب اتنے سالوں بعد اس کے یہاں چلے آنے پر جہاں سب قریبی رشتے داروں نے حیرت کا اظہار کیا تھا، وہاں یہ بھی کہا تھا ''وہاں اب کیا رکھا ہے اور کون رہتا ہے جو تم وہاں جا رہے ہو؟'' مگر اس وقت اس کے دماغ میں سمائی ہوئی تھی کہ اسے اب پاکستان جانا ہے۔ وہ یونائیٹڈ نیشنز کے ایک ذیلی ادارے میں کام کرتا تھا اور اس نے خود کہہ کر اس بار اپنا ٹرانسفر فرانس سے پاکستان کروایا تھا۔ اتنے سالوں کی غریب الوطنی کے بعد اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ وطن جائے اور اس مانوس فضا میں سانس لے مگر اس کا یہ شوق، یہ ولولہ یہاں آنے کے چند ہی دنوں بعد مدہم پڑنے لگا تھا۔ یہاں اس کے اپنے بقول سب کچھ بدل گیا تھا یا پھر شاید اب وہ خود اس زندگی کا عادی نہیں رہا تھا۔ قبل اس کے وہ گھبرا کر کسی کے سامنے اپنی حماقت کا اعتراف کرتا اسے یہ لڑکی

نظر آ گئی، جس کا نام منفرد تھا اور مانوس بھی ''نگار السحر .....''

اسے بہت عرصے پہلے اوائل عمری کی بہت سی باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ خود، سلمان، نجمی آپا، ماہین، نگین، رابعہ، شازیہ، می می، رضوان، سنی اور عرفی۔ گہما گہمی، بھاگ دوڑ اور چہل پہل کے وہ دن.....!

''کیا مجھے چھوڑ کر آنے کے لیے کوئی گاڑی اور ڈرائیور ہے؟'' اس کے کانوں میں اس لڑکی کی آواز آئی جو اس وقت بہت چھوٹی تھی اور اب بڑی ہو گئی تھی۔ وہ مسز ستار سے مخاطب تھی۔ جواب میں وہ اسے اس ہال سے باہر لے گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے خود بھی ستار واڈیا سے معذرت کی اور باہر نکل آیا۔ وہ باہر انٹیرنس پر، طویل روش پر، گیٹ کے پاس، پارکنگ لاٹ میں کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ جا چکی تھی۔ اس نے کچھ دیر وہیں کھڑے کھڑے ادھر اُدھر نظر دوڑائی اور پھر شانے اچکا کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اسی دم آسمان پر چھائے بادل بارش کے قطرے برسانے لگے۔ اس نے گاڑی سٹارٹ کی اور دانستہ طور پر شیشے نیچے کر دیئے۔

اسے اپنے ملک میں برسنے والی بارش کا یہ نظارہ بہت عرصے بعد دیکھنے کو ملا تھا۔ پانی کے قطرے خشک مٹی پر پڑے تو مانوس خوشبو نتھنوں سے آ ٹکرائی۔ وہاں ملک سے بہت دور..... ان بہت سے ملکوں میں جہاں وہ گھوما، پھرا، رہا، کبھی بارش کے قطروں نے مٹی سے خوشبو نہیں اٹھائی بلکہ اس مٹی کو تو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی کراہیت محسوس ہوتی تھی، ہاتھ گندے نہ ہو جائیں مگر یہ مٹی، کتنی سوندھی خوشبو ہے، اس میں، جی چاہتا ہے ہاتھ بڑھاؤ اور مٹھی میں پکڑ لو۔

وہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ٹریفک سگنل پر سرخ بتی جل اٹھنے کی وجہ سے وہ بھی رکتی گاڑیوں کی طویل قطار میں رک گیا۔ روشنیوں کے سائے میں چمکتی برستی بارش میں گیلی ہوتی طویل سڑک کو دیکھتے دیکھتے اس کی نظر اپنے سے چند گز کے فاصلے پر کھڑی گاڑی پر پڑی۔ یہ گاڑی وہی تھی جو نگار السحر کو گھر پہنچانے جا رہی تھی۔ ڈرائیور کے پیچھے وہ تنہا بیٹھی تھی۔ ایک لمحے کو اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی گاڑی اس گاڑی کے پیچھے لگا دے۔ مگر ٹریفک سگنل کھلنے پر حرکت میں آتی گاڑیوں کے ساتھ گاڑی دوڑاتے ہوئے اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور دائیں جانب جاتی ذیلی سڑک کی طرف مڑ گیا۔

جس وقت وہ جدید خطوط پر لگژری اپارٹمنٹس میں واقع اپنے خوبصورت آرام دہ فلیٹ تک پہنچا، رات کے بارہ بج چکے تھے۔ نیچے گراؤنڈ فلور پر زندگی جاگ رہی تھی۔ بچے کھیلتے پھر رہے تھے۔ بڑے ادھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ وہ اوپر پہنچ کر ڈور لاک کھولتے ہوئے اتنے سالوں میں ملک میں در آنے والے انقلابات اور تبدیلیوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''جدید ترین خطوط پر استوار اعلیٰ کوالٹی کی زندگی۔'' اس نے کپڑے تبدیل کر کے اپنے بیڈ روم کی کھڑکی کھول کر نیچے دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''یہ وہ پاکستان ہے جس کے مسائل اور پریشانیوں سے گھبرا کر میرے تقریباً سارے خاندان نے فرسٹ ورلڈ کا رخ کیا'' پھر اس کی نظروں کے سامنے بہت سے پرانے منظر، بہت

سے مانوس چہرے گھوم گئے۔ ابا جان، امی، اسد بھائی، مینا آپا، خالہ سلمٰی، خالو، ریحان، سلمان، سارہ آپی اور پھر ان کے ساتھ ہی اسے ممتاز خالو کے بھائی اعجاز صاحب یاد آئے، جنہیں سلمان وغیرہ چاچا جان کہتے تھے۔ بچپن میں بہت مرتبہ وہ اپنے ان کزنز کے ساتھ چاچا جان کے گھر گیا تھا۔ وہ کسی حکومتی محکمے کے بڑے افسر تھے اور محکمے کی جانب سے ملے گھر میں رہتے تھے۔ جی او آر ون میں غالباً اس نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ ''کیا خوبصورت اور شاندار گھر تھا ان کا اور ان کی بیگم چی جان!'' پھر اسے یاد آیا۔

''کیا طمطراق والی خاتون تھیں مگر کتنی وضع دار اور نرم گفتار تھیں۔'' اس کی نظروں کے سامنے وہ چہرہ بھی گھوما۔

''ان کے والد تقسیم سے پہلے بھی بڑے افسر تھے۔ تقسیم کے بعد جب یہاں آئے تو بہت اچھی پراپرٹی الاٹ ہوئی ان کو، ان کی بی بی کی زندگی بڑے شاہانہ ماحول میں گزری، اچھی خاصی پڑھی لکھی ہیں۔ ریاست بھوپال کے رہنے والے ہیں۔ یہ لوگ خاندانی، وضع دار اور انتہائی شریف۔'' اسے یاد آیا ایک بار امی نے بتایا تھا۔ ان لوگوں میں یقیناً کوئی بہت خاص بات تھی جو اسے چاچا جان کے گھر جانا پڑا اچھا لگتا تھا۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹا کوئی نہیں تھا۔ ماہین، نگین اور نگار السحر۔ وہ سینٹ انتھونی میں پڑھتی تھیں۔ اور بڑی پراعتماد تھیں۔ اسے ان دونوں بڑی بہنوں سے بھی باتیں کرنے میں مزہ آتا تھا۔

اسے اس گھر کا وسیع لان، جس میں عمدہ ٹینس کورٹ اور بیڈمنٹن کورٹ بنا ہوا تھا۔ بہت اچھا لگتا تھا۔ لان میں لگی اونچے سٹینڈ والی لائٹس۔ کبھی کبھی اس گھر میں منعقد ہونے والے بڑے عشائیوں میں وہ بھی بطور خاص جایا کرتا تھا محض دیکھنے کے لیے کہ وہاں کیا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں اتنے ٹھاٹ ہر کسی کے تو نہیں ہوتے تھے خصوصاً ان کے خاندان اور حلقۂ احباب میں سو یہ ان سب کے لیے خصوصی تفریح ہوتی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ وقت نے ٹھیک ٹھاک کروٹ بدلی۔ فرحان بھائی امریکہ سیٹل ہو گئے، سارہ آپی بیاہ کر آسٹریلیا چلی گئیں۔

مینا آپا کی شادی بڑی خالہ کے عثمان بھائی سے ہو گئی اور وہ انگلینڈ چلی گئیں۔ انہوں نے پہلے اسد بھائی کو اور پھر خود اسے اسپانسر شپ پر وہاں بلا لیا۔ اس زمانے میں یہ کچھ اتنا مشکل نہ تھا۔ اسے لیسٹر یونیورسٹی میں ایڈمیشن مل گیا۔ ریحان بھائی اپنی باقی ماندہ فیملی کو امریکہ سیٹل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اسد بھائی تعلیم مکمل کر کے کینیڈا شفٹ ہوئے، ابا امی ان کے پاس چلے گئے۔ یوں دھیرے دھیرے پاکستان سے رخصتی کے بعد ادھر سے تعلق تقریباً ختم ہو گیا۔ ابا اور امی، خالہ اور خالو سب کا انتقال وہاں ہوا اور اس خیال سے کہ کیونکہ وہ سب لوگ تو وہاں تھے، ان کی تدفین بھی وہیں کی گئی۔ یوں وہ بات بھی ختم ہو گئی جس کے تحت بقول شخصے اپنوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لیے ہی کوئی یہاں آتا۔ وہاں وہ سب اسٹیبلش ہو چکے تھے۔ وہ اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد امریکہ چلا گیا۔ چند سالوں بعد اسے یو این او میں نوکری مل گئی اور اس کا خانہ بدوشوں کا سا سفر

شروع ہو گیا۔ فرسٹ فیملی ممبرز سے رابطہ البتہ ہر جگہ رہا۔

اس کے اپنے بہن بھائی جو شادیوں کے بعد پرسکون زندگی گزار رہے تھے، اس کو شادی کر لینے کا کہتے رہے، آپا نے بہت سی پاکستانی لڑکیوں کا مختلف مواقع پر انتخاب بھی کیا۔ امی ابو، اس کی شادی کا انتظار کرتے دنیا سے ہی چلے گئے۔ اب تو یہ حال تھا کہ سب لوگ اسے یہ بھی کہہ چکے تھے کہ کسی بھی ملک کی سہی، کسی بھی مذہب سے تعلق سہی بس تم شادی کر لو، مگر خود اسے بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اب تک کیوں اکیلا تھا۔ اس کی بے شمار دوستیاں تھیں، وہ بے شمار لڑکیوں سے ملا تھا، ملتا تھا مگر شادی والے نقطے پر اس کا ذہن کبھی ٹھہرا ہی نہیں اور اب تو وہ کوئی نوجوان لڑکا نہیں تھا۔ تینتیس چونتیس سال کا مرد تھا۔ گو اس کا چہرہ مہرہ اور جسامت اس کی اصل عمر قطعی ظاہر نہیں کرتی تھی اور وہ ستائیس اٹھائیس سال سے اوپر کا نہیں لگتا تھا، مگر مسئلہ یہ تھا کہ جسمانی عمر سے کہیں زیادہ اس کی ذہنی عمر تھی جو شادی والے مسئلے پر اس کے آڑے آ جاتی تھی اور اب تو وہ اس طرح کی زندگی کا عادی ہو چکا تھا۔ اس کے سب کزنز اسے فون کرتے یا میل کرتے، اسے ڈیر کنفرمڈ بیچلر کہہ کر مخاطب کرتے تھے اور جب انہوں نے سنا کہ وہ پاکستان جانے کا ارادہ کر رہا ہے تو سب نے اس کا مذاق اڑانے اور اسے خوفزدہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ مگر اس بار نہ جانے اس کے دل میں کیا سمائی تھی کہ اس نے پاکستان آ کر ہی دم لیا اور اب پاکستان کے بدلے ہوئے معیار زندگی، ماحول، سوشل سرکل اور ویلیوز میں ایڈجسٹ کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ اب تو اسے لگنے لگا تھا کہ وہ جلد ہی یہ ملک ایک بار پھر چھوڑ جائے گا۔

''چلو اگر یہاں سے جانے کا پروگرام بن ہی گیا تو جانے سے پہلے ایک پرانا چہرہ تو نظر آیا'' اس نے دیر تک کھڑکی کے پاس کھڑے رہنے اور باہر کا نظارہ کرتے ہوئے کچھ سوچنے کے بعد کھڑکی بند کر کے پردے برابر کرتے ہوئے سوچا۔

☆

اس واقعہ کے دو ہفتے بعد ''نگار السحر'' سے اس کی دوسری اتفاقیہ ملاقات لبرٹی میں کریم بخش پر ہو گئی۔ وہ نکلا ئیز خریدنے وہاں گیا تھا۔ جب یونہی وہاں کے مختلف فلورز پر گھومتے گھومتے کاٹن کلاتھ والے کارنر پر وہ اسے نظر آ گئی۔

''کیا پتہ وہ نہ ہو؟'' اس نے اسے دیکھ کر اس کی طرف جاتے جاتے سوچا۔ چلو پھر بھی پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟ پھر اسے دوسرا خیال آیا اور وہ اس کے سر پر پہنچ گیا۔

''ہیلو، میرا خیال ہے کہ آپ کا نام نگار السحر ہے'' اس نے دل میں جھجکتے ہوئے مگر بظاہر بہت پراعتماد انداز میں اسے مخاطب کیا، جواب میں وہ چونک گئی۔

''جی ہاں، مگر آپ.....'' اس نے سر اٹھا کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''مجھے افسوس ہے میں نے

آپ کو پہچانا نہیں؟''

''پہچان بھی کیسے سکتی ہیں جبکہ عرصہ ہوا آپ نے مجھے نہ دیکھا نہ میرے بارے میں کچھ سنا'' وہ مسکرا کر بولا۔ جواب میں اس کی مخاطب کی آنکھوں کی پتلیاں کچھ اور سکڑ گئیں۔ وہ یقیناً یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''آپ اعجاز صاحب کی بیٹی ہیں نا وہ جو غالباً ڈپٹی سیکرٹری تھے کسی فیڈرل ڈیپارٹمنٹ کے محکمے میں۔''

''جی ہاں، مگر آپ!'' وہ اب تک حیرت کے سمندر میں تیر رہی تھی۔

''میرا نام ہمایوں مراد ہے، میں آپ کے چچازاد بھائی سلمان کا خالہ زاد ہوں، شاید آپ کو اب بھی یاد نہ آیا ہو کیونکہ یہ شناسائی اس زمانے کی بات ہے جب آپ بہت چھوٹی ہوا کرتی تھیں'' اس نے بالآخر اس کا تجسس ختم کرتے ہوئے کہا۔

''ہمایوں!'' اس نے یاد کرتے ہوئے کہا ''ارے، آپ ممتاز انکل کے ان لاز میں سے ہیں نا؟'' وہ پہچان کر بولی۔

''ہاں۔''

''آپ کا بہت ذکر ہوتا رہتا تھا ہمارے گھر میں، میرا مطلب ہے آپ کی فیملی کا۔ آپ تو کہیں باہر.....'' پھر اس نے ایک اور بات یاد کی ''آپ کب آئے یہاں، پاکستان..... کہاں رہ رہے ہیں۔ آپ کی بیوی بچے.....؟''

''بس۔'' ہمایوں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا ''کچھ زیادہ ہو گیا'' پھر اس نے مختصر لفظوں میں اسے اپنا احوال سنایا۔

''اوہ.....تو یہ بات ہے'' وہ سننے کے بعد گہرا سانس لے کر بولی ''آپ گھر آئیے گا۔ اماں آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔''

''ایسا ہے کہ میں تو شہر کے سارے راستے بھول چکا ہوں۔ بھول کیا گیا ہوں، سارے راستے سارے نقشے ہی بدل چکے ہیں۔ میں جس راستے کو جو سمجھ کر نکلتا ہوں، وہ وہ نہیں ہوتا، آپ لوگ ابھی وہیں رہتے ہیں، جی او آر میں کہ کہیں اور شفٹ ہو چکے؟'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔

'جی او آر' اس نے سر اٹھا کر حیرت سے کہا ''ارے، وہ تو مدت ہوئی چھوٹ گیا۔ اب ہم ماڈل ٹاؤن میں رہتے ہیں جو فرصت ہو تو ابھی چلئے۔ میں آپ کو راستہ بھی بتا دوں گی۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔'' ہمایوں فوراً تیار ہوا ''شاپنگ مکمل ہو گئی آپ کی؟''

''جی، بس یہ بل پے کر لوں۔'' وہ مین کاؤنٹر کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ راستے اور نقشے واقعی بدل چکے تھے۔ اس کا یہ خیال لبرٹی سے ماڈل ٹاؤن جاتے راستے پر ڈرائیو کرتے ہوئے مزید پختہ ہو گیا تھا۔

''کب شفٹ ہوئے، آپ ماڈل ٹاؤن'' اس نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے پوچھا۔

''عرصہ پہلے، ابا کی ڈیتھ سے دو سال پہلے جب وہ ریٹائر ہوئے۔''

''ہیں.....'' ہمایوں کا ہاتھ اسٹیئرنگ پر پھسلا ''چاچان کی ڈیتھ ہوگئی؟''

''آپ کو علم نہیں؟'' نگار السحر نے حیرت سے اسے دیکھا ''اس واقعے کو تو اب تقریباً آٹھ سال ہونے کو ہیں۔''

''کمال ہے، کسی نے ذکر تک نہیں کیا۔ مانی لوگوں نے بھی نہیں'' اسے حقیقت میں سخت افسوس ہوا تھا۔ ''کیا ہوا تھا ان کو، ان کی عمر کچھ اتنی زیادہ تو نہیں تھی؟''

''ہارٹ فیلیئر جو اکثر موت کا جواز بنتا ہے آج کل'' وہ عجیب طریقے سے مسکرا کر بولی تھی۔ اس کے لہجے کی تلخی محسوس کی جاسکتی تھی۔ جواب میں ہمایوں کچھ نہیں بولا۔ اس کے بتائے ہوئے راستوں پر مڑتے چلتے وہ ماڈل ٹاؤن کی ایک ایسی روڈ کی طرف جا نکلے جس کے بالکل آخر پر وہ گھر تھا جس کے بارے میں نگار نے بتایا تھا۔ اس لین کے شروع کے گھر تو اچھے اور بہتر تھے مگر یہ گھر کبھی شاید بہت اچھا ہو مگر اب اس کی حالت شکستہ ہو رہی تھی۔ بیرونی دیواروں پر کہیں کہیں کائی کی تہ چڑھی ہوئی تھی۔ نگار نے اتر کر گیٹ کھولا۔ شکستہ سا گیٹ وے اور چھوٹا سا گیراج جس میں پرانا سامان اور ایک پیٹی رکھی تھی یعنی گاڑی اس پورچ میں نہیں جاسکتی تھی۔ وہ گیٹ وے پر ہی رک گیا۔ ایک سائیڈ پر اجڑا، ویران چھوٹا سا لان تھا جس کی گھاس جو کبھی تھی، اب پھونس میں تبدیل ہو چکی تھی۔ اجڑے بے ترتیب پودے، ہمایوں کو اس درجہ وحشت اور ویرانی ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ نگار نے پورچ میں لگے لکڑی کے جھولتے ہوئے سوئچ بورڈ سے ایک بٹن دبایا۔ بیرونی گیٹ کے قریب لگے لائٹ پول پر ایک زرد سا بلب جلنے لگا۔

''آیئے!'' اس نے سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں کھلنے والا ایک دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ یہ کمرہ نشست گاہ کا تھا۔ جدید زبان میں اسے ٹی وی لاؤنج کہا جاسکتا تھا۔ پرانے سے فرنیچر اور قالین سے سجا ہوا۔ ایک دیوار کے ساتھ رکھے دیوان پر گاؤ تکیے کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھی ایک بوڑھی سی خاتون آنکھوں پر عینک لگائے کچھ پڑھنے میں مشغول تھیں۔

''امی! دیکھیں، کون آیا ہے؟'' نگار نے آگے بڑھ کر انہیں مخاطب کیا۔ انہوں نے سر اٹھایا۔ ہمایوں ششدر رہ گیا۔ وہ چچی جان تھیں۔ جھریوں زدہ چہرہ کمزور و ناتواں جسم، سفید بال، کتنے سال گزر گئے ان پر؟ اس نے دل میں سوچا۔ وہ پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں مگر یقیناً پہچان نہیں پا رہی تھیں۔

''امی! یہ ہمایوں بھائی ہیں۔ مانی بھائی لوگوں کے خالہ زاد! آپ کو تو یاد ہوگا'' نگار نے ان کی الجھن دور کی۔

''اررے.....'' وہ ایک دم دیوان سے ٹانگیں لٹکا کر بدقت اٹھ کر کھڑی ہوئیں ''آؤ بیٹا! کیا

کروں، پہچان بھی کمزور ہے، نظر بھی، انہوں نے اس کے جھکے سر پر پیار دے کر اس کی کمر پر ہاتھ پھیرا ''بیٹھو'' پھر انہوں نے دیوان کے قریب رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ان کے ہاتھ بھی کانپ رہے تھے۔ ہمایوں نے اندازہ لگایا۔

''ناقابل یقین'' وہ سوچ رہا تھا ''مگر کیسے جھٹلایا جا سکتا ہے۔ میں خود اپنی آنکھوں سے تو دیکھ رہا ہوں'' وہ اب ذرا سنبھل کر بیٹھی اس سے سب کے بارے میں اس کے اپنے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔

''عرصہ دراز سے کبھی کوئی آیا نہ گیا، نہ کوئی خیر خبر، نہ اتا پتا، جب ہی تم آئے ہو تو خوشی سے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے ہیں'' انہوں نے سادگی سے اعتراف کیا۔

''پی جان! یہ......'' ہمایوں نے کمرے میں چاروں طرف نظریں گھماتے ہوئے تذبذب کے عالم میں کہا ''یہ، سب کیا ہے؟'' اس کے دل میں دبا سوال آخر نکل گیا۔ ان کا یہ حال کسی طرح بھی اس شاندار ماضی سے میل نہیں کھا رہا تھا جس کا وہ عینی شاہد تھا۔ کہاں وہ شان و شوکت، ٹھاٹ باٹ اور کہاں یہ زبوں حالی ان کی اپنی شخصیت بارعب، آن بان والی اور یہ خاتون......'' یہ تو اس خاتون کی ایک ذرا سی بھی جھلک نہیں دے رہی تھیں۔

''بس بیٹا!'' انہوں نے سر جھکا کر یوں کہا جیسے اس سارے میں سارا قصور صرف انہی کا ہو۔ ''کبھی کے دن بڑے اور کبھی کی راتیں...... سنا کرتے تھے، بادشاہوں کی اولاد پر بھی ایک وقت وہ آیا تھا جب ہاتھ میں کٹورے لیے روٹی کی خاطر دروازوں پر دستک دیتے پھرتے تھے۔ ہم ان سے تو پھر بھی بہتر رہے، اللہ کا شکر ہے۔''

''مگر اس کہانی کا کچھ محرک بھی تو ہو گا؟'' ہمایوں کو لگا جیسے ان کی شستہ زبانی کے سامنے وہ بھی اپنی زبان کا ماڈ بدلنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

''قسمت اور وقت سے بڑا محرک کون ہو سکتا ہے بیٹا! یہ دونوں ہی محرک ہوتے ہیں ہر بات کے پیچھے۔''

''مگر یہ گھر...... آپ لوگ......!'' اس نے ان سنی کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنی حیرت کا اظہار کیا۔

''اعجاز آغا کی ریٹائرمنٹ سے حالات اور وقت کے چکر نے ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ تم جانو وہ پچھلے زمانے کے سادہ دل انسان تھے۔ تمام عمر ایمانداری سے وقت گزارا۔ اتنی بڑی پوسٹ پر رہتے ہوئے بھی اپنے لیے کوئی فیور نہیں لیا۔ ریٹائر ہوئے تو جو واجبات ملے اپنے دیرینہ کولیگ کے ساتھ مل کر کاروبار میں لگا دیئے۔ ساری عمر سرکار کی نوکری کی تھی، کاروبار کا نہ کوئی سلیقہ تھا، نہ تجربہ۔ اتنے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ تعلقات تھے۔ کوئی مدد کو، مشورے کو نہیں آیا۔ سب ڈوب گیا۔ ٹینشن ڈیپریشن نے دو جدید بیماریاں عطا کیں۔ جنہیں دل کی بیماری اور بلڈ پریشر کہتے ہیں۔ دل کو غم لگا، اٹوائی کھٹوائی لے کر گھر میں بیٹھ گئے۔ نہ کسی سے ملتے نہ ملاتے۔ زیادہ غم تعلق داروں کی بے اعتنائی کا تھا۔ تمام عمر توفیق بھر لوگوں کی مدد کرتے رہے، مصیبت

پڑنے پر کوئی بھی کام نہ آیا۔ وزیروں، مشیروں، چیف منسٹر، گورنر تک کو خط لکھتے رہتے۔ فون کرتے رہتے، سب تسلیاں دے کر بہلا دیتے۔ بس یونہی دن گزرتے رہے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مسلم ٹاؤن میں گھر کرائے پر لیا تھا۔ بوجھ، فکریں بڑھتی رہیں'' وہ دم لینے کو رکیں۔

''ماہین آپی، ابا کا بازو بن کر جاب کرنے نکلیں'' ساتھ والے کمرے سے نگار نکل کر آئی، وہ یہاں آنے کے فوراً بعد سے غائب تھی۔ اب چائے کی ٹرے اٹھائے آئی تھی اور اس نے چچی جان کی بات کا تسلسل اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

''ماہین آپی کو ایرانی قونصلیٹ میں جاب مل گئی تھی۔ انہوں نے پرشین پڑھ رکھی تھی، کچھ ٹرانسلیٹر ٹائپ جاب تھی۔ چھ ماہ ہی ہوئے تھے جاب کو کہ ایک صاحب ہرمز گلچیر سے شناسائی ہوئی، موصوف مذہباً پارسی تھے، آتش پرست۔ آپ یہ کباب لیں نا ہمایوں بھائی! امی نے بنائے ہیں، چکن کے ہیں'' وہ بات سناتے سناتے بیچ میں ہمایوں کو کباب آفر کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''یہ شناسائی، مزاج آشنائی تک بڑھی اور پھر شادی پر منتج ہوئی جسے اماں کتھدائی کہتی ہیں۔ میں نے درست کہا نا امی!'' وہ کنفرم کرنے کو رکی۔ ہمایوں نے ایک نظر چچی جان پر ڈالی وہ یونہی شرمندہ سی بیٹھی تھیں جیسے سارا قصور ان کا ہو۔

''شادی کر لینے کے بعد اطلاع دینے کے لیے گھر آئیں۔ ابا نے کھڑے کھڑے نکال دیا، روایتی مشرقی باپوں والا رول۔ آپ تکلف کر رہے ہیں ہمایوں بھائی یا میری داستان گوئی میں گم ہیں؟'' اس نے پھر رک کر براہِ راست اس کو مخاطب کیا۔ ہمایوں نے سر جھٹکا اور گھر پر بنے کیک کا ایک پیس اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

''امی ابا نے بلکہ ہم سب نے اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا مگر قسمت کے نرالے کھیل ابھی دیکھنے کو ملنے والے تھے سو انہیں بھی دیکھ لیا۔ ماہین آپی کے بعد نگی آپی کی باری تھی۔ وہ آوازی میں ریسپشن پر کام کرتی تھیں۔ ساؤتھ افریقہ کی کرکٹ ٹیم کھیلنے کے لیے آئی، ان کے ساتھ کوئی تماشائی تھا یا کیا تھا، ایک سیاہ فام ساؤتھ افریقن سے دوستی ہوئی جو بڑھ کر اس گھر کی دوسری ایسی شادی پر منتج ہوئی جس میں گھر کا کوئی فرد شامل نہ تھا اور جو ایسی شادی تھی جو ہمارے ماں باپ پر قیامت بن کر ٹوٹی..... چینی کتنی لیں گے آپ؟'' اب وہ پیالیوں میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

''ایک چمچ!'' ہمایوں نے کہا ''پھر کیا ہوا؟'' وہ اس داستان کے ایک ایک لفظ پر حیرت کے سمندر میں غرق ہو رہا تھا۔

''پھر کیا ہونا تھا، ابا کی صحت کے بارے میں، مالی حالات کے بارے میں امی آپ کو پہلے ہی بتا چکی ہیں۔ ان کا خاتمہ کرنے کے لیے یہ دو نئے فیکٹر کافی تھے سو خاتمہ ہو گیا۔ امی تنہا بے یارو مددگار، ہر طرف سے

سوال، ہر طرف سے طعن و تشنیع، گھر ٹھکانا کوئی رہا نہ تھا۔ ایسے میں نانا ابا کا یہ گھر جو نہ جانے انہوں نے کب بنایا تھا اور اس وقت تک کرائے پر چڑھا رکھا تھا، ماموں میاں نے امی کو گفٹ کر دیا سو تب سے ہم یہاں مقیم ہیں۔ اس کی ظاہری حالت پر مت جایئے گا، ہم نے بے سروسامانی کا عالم دیکھا ہے۔ بے ٹھکانا ہونے کا مزہ چکھا ہے، ہمیں یہ کاخ امراء سے کم نہیں لگتا۔ سر پر چھت تو ہے نا؟'' اس کی گفتگو کا سلسلہ گھر کے سلسلے میں وضاحت پر آ کر رک گیا تو کمرے میں سناٹا چھا گیا۔

''آپ چپ ہو گئے ہمایوں بھائی! اور آپ بھی امی!'' اس خاموشی کو بھی کچھ دیر بعد نگار ہی نے توڑا

''امی ناراض ہو گئیں شاید..... میں نے اپنی مشترکہ کہانی کے تکلیف دہ ترین قصے سنا ڈالے اس لیے شاید۔ امی کو ساری بات کا ڈر لگا رہتا ہے کہ بھولے بھٹکے اگر کوئی ہم سے ایسا بندہ ملنے آ جائے جسے ماہین و نگین آپی والے قصوں کا علم نہ ہو تو اگر اسے علم ہو جائے تو وہ دوبارہ مڑ کر نہیں آتا۔ مگر امی! ہمایوں بھائی لاکھ ہم سے ملنے کے بعد جب کبھی مانی بھائی وغیرہ سے بات کرتے تو خاندان کے ہم سے بائیکاٹ کا معاملہ ضرور زیر گفتگو آتا۔ وہ دوسروں سے کیوں سنیں، ہم کیوں نہ سنا دیں ان کو۔ ٹھیک ہے آج آ گئے ہیں، بہت شکریہ..... پھر نہ بھی آئیں گے تو فیصلہ انہیں کرنا ہے گلہ کس بات کا؟'' ہمایوں نے ایک نظر اس لڑکی پر ڈالی جو اتنی بڑی بڑی باتیں بے تاثر چہرے کے ساتھ کیے جا رہی تھی۔ اسے اس ٹریجک کہانی کے تمام المناک پہلوؤں پر دکھ ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے؟

''میں اتنے سالوں میں کبھی بھی مانی وغیرہ سے رابطے کے بغیر نہیں رہا۔ مگر میرا خیال نہیں کہ کبھی بھولے سے کسی نے ذکر کیا ہو۔'' بالآخر اس نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا ''یا پھر یہ بھی ہوا کہ ہم سب اپنی اپنی زندگیوں میں اتنے مصروف تھے کہ آپ لوگوں کا کبھی ذکر ہی نہیں ہوا مگر اتنے قریبی تعلق داروں پر یوں قیامتیں گزر جائیں تو بندہ ذکر نہ آتے ہوئے بھی ذکر کر بیٹھتا ہے، یہ باتیں جو آپ لوگوں نے دو لفظوں میں سنا دی ہیں۔ جب یہ حقیقت میں وقوع پذیر ہو رہی ہوں گی تو آپ پر کیا گزری ہو گی یہ میں سمجھ سکتا ہوں۔'' اس کو الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے مشکل پیش آ رہی تھی۔

''سب عزیز، رشتے داروں نے تو بیٹیاں تعلق توڑا ہم سے، جیسے منتظر ہوں کہ کب اس فیملی پر ڈاؤن فال آئے اور ہم ان سے تعلق توڑیں۔ ان کا تو وہ حال ہوا مانو تاک میں بیٹھا الو، بھر بھر مانگے چلو!''

''جی!'' ہمایوں کو یہ بات خاک پلے نہ پڑی۔

''امی اردو کی ماسٹر ہیں۔ ابا کی ڈیتھ کے بعد ایک سکول میں اردو پڑھاتی ہیں۔ ایسے باپ کی بیٹی ہیں جو دانشور اور ادیب بھی تھے۔ سو بامحاورہ اردو بولنے کی عادی ہیں۔ آپ کو ان کے بہت سے محاورات نہ سمجھ شاید دیر سے آئے یا پھر آئے ہی نہیں'' نگار نے ہنس کر کہا۔

''آپ سمجھا دیں۔ عزیز رشتے داروں کے سلسلے میں جو محاورہ انہوں نے ابھی کہا ہے، اس کا کیا

مطلب ہے؟'' ہمایوں کو تجسس ہوا۔

''ان کا مطلب ہے وہ عزیز رشتے دار جو کبھی ہمارے ابا کی جوتیاں سیدھی کرتے تھے، حالات بدلنے پر یوں ہم پر حکم چلانے لگے جیسے ہم ان کے بے دام غلام ہوں۔''

''اوہ!'' ہمایوں نے سمجھتے ہوئے افسوس کا اظہار کیا۔ ''مانی لوگوں کے بارے میں میرا یہ خیال نہیں تھا کہ وہ اتنے بے حس ہوں گے۔ کسی نے آپ سے اظہار افسوس نہیں کیا، کوئی ہمدردی، تسلی نہیں؟''

''اب میں کچھ بولوں گی تو نگار کہے گی امی چھوڑیں، آپ کیوں بولتی ہیں ان لوگوں کے بارے میں؟ وہ لوگ اپنی زندگیوں میں سیٹ ہیں، بیٹا! سب آپس میں ملتے ہیں وہاں آسائش آرام سب مہیا ہے۔ ایسے میں وطن میں موجود بے کس رشتے دار کس کو یاد آتے ہیں۔ ان کی بلا سے بدھیا مرے تو مرے آگرہ تو دیکھو والی بات کو پورا کر رہے ہیں، وہ لوگ۔ ہاں تمہاری خالہ مرحومہ نے ماہین و نگین والے واقعے پر خوب بڑھ چڑھ کر باتیں بنائی تھیں۔ ان کے خیال میں ہم دونوں میاں بیوی کی تربیت ہی غلط تھی جو ہم نے بچیوں کو بے جا آزادی دے رکھی تھی، اسی کا نتیجہ وہ پارسی اور عیسائی ہندو داماد تھے۔'' چی جان آزردگی سے بولیں۔

''ہندو!'' ہمایوں کو لگا یا تو اسے سننے میں یا پھر چی جان کے بولنے میں غلطی ہوئی۔ نگار نے ہونٹ بھینچتے ہوئے ایک نظر ماں پر ڈالی۔

''تو کیا فرق پڑتا ہے بیٹا، جہاں اتنی جوتیاں کوئی مارے گا، وہاں ایک اور سہی، اب جو حقیقت بتانے پر تلے ہی ہیں تو پوری کیوں نہ بتائیں۔'' وہ صاف گوئی سے بولیں۔

''جی ہاں ہندو'' نگار کو گویا ایک اور بات سنانے کا اجازت نامہ مل گیا۔

''نگین آپی زیادہ دیر اس سیاہ فام ساؤتھ افریقن کے ساتھ رہ نہیں سکیں، اس سے طلاق لے کر وہیں پر مقیم ایک ہندو تاجر سے شادی کر لی۔ آج کل اٹلی میں رہتی ہیں۔ سنا ہے ابھی تک تو اسی کے ساتھ ہیں۔''

''سنا ہے'' ہمایوں نے دُہرایا ''آپ نے کسی سے سنا ہے، آپ لوگوں کے ساتھ ان کا بلاواسطہ کوئی رابطہ نہیں ہے۔''

''یہ ممکن ہو سکتا ہے بھلا!'' چی جان اٹھ کر وضو کرنے گئیں تو نگار نے قدرے بلند آواز میں کہا ''لوگوں نے تو خوب باتیں بنائیں اور اب بھی بناتے ہوں گے مگر یہ حقیقت ہے امی نے ان دونوں کو اپنے دل اور یادوں سے یوں نکال پھینکا ہے جیسے وہ کبھی تھیں ہی نہیں۔ ان دونوں نے ابا کے بعد رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر امی نے سختی سے منع کر دیا۔ اس کے بعد ہم سے کوئی رابطہ نہیں ہے ان کا۔ اب کبھی ان کی کسی پرانی دوست سے ملاقات ہو جائے تو معلوم ہوتا ہے نیٹ وغیرہ پر ان کی کوئی بات چیت ہوئی ہو تو، مجھے پتہ چلے بھی تو امی سے ذکر نہیں کرتی، کیا فائدہ خوامخواہ آزردہ ہوں گی، منانے کو اور غم کیا کم ہیں۔''

''اور امی کی یہ ایکسپیشنل بیٹی کیا کر رہی ہے آج کل؟'' ہمایوں نے یوں بے تکلفی سے پوچھا

جیسے وہ کسی ایسی دوست سے عرصہ بعد ملا ہو جسے وہ بہت اچھی طرح جانتا ہو۔

''آپ سوچ سکتے ہیں، میں کیا کر سکتی ہوں ان حالات میں؟'' وہ، جواب تک اتنے تلخ حالات کی کہانی بھی انتہائی لائٹ موڈ میں سنا رہی تھی، یکدم سنجیدہ ہو گئی اور پھر مکمل خاموش بھی ہو گئی۔ اس کے بعد وہ ایک دم اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں جو غالباً کچن تھا، غائب ہو گئی۔

''نگار کہاں گئی؟'' چی جان وضو کر کے آئیں تو پوچھا۔

''کچن میں شاید'' ہمایوں نے قریب تپائی پر رکھا سنہری منقش ڈیکوریشن پیس غور سے دیکھتے ہوئے کہا ''چی جان! میرا خیال ہے کہ نگار میرے اس سوال پر کہ وہ آج کل کیا کر رہی ہے، ناراض ہو گئی ہے۔''

''ہاں بیٹا!'' چی جان تخت پر بیٹھ کر اسی طرح افسردگی سے سر جھکاتے ہوئے بولیں۔ ''کیا کیا خواب نہ ہوں گے اس کے دل میں اپنی زندگی کے بارے میں، سب حالات کی گردش اور بہنوں کی خودغرضیوں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ تعلیم ادھوری رہ گئی، سارے شوق ختم ہو گئے۔ جو باقی رہا وہ غم روزگار تھا اور آئندہ آنے والے دنوں کی فکر۔ پھر اس کی عمر کیا تھی جو اس نے ساری ذمہ داریاں اٹھالیں۔''

''اب کیا کرتی ہے یہ، میرا مطلب ہے کہیں جاب وغیرہ؟''

''اس کے ابا کی وفات کے بعد میں نے نوکری کر لی الینا فاؤنڈیشن میں مگر پھر ذہنی حالت ساتھ دینے سے انکاری ہوئی، اس نے ابھی گریجویشن مکمل کیا ہی تھا، ایک انگلش میڈیم سکول میں آرٹ اور میوزک ٹیچر کی جاب مل گئی کیونکہ بنیادی تعلیم اچھے اداروں سے حاصل کی تھی۔ اے لیول کیا ہوا تھا۔ حکمول کے زمانے میں میوزک اور فائن آرٹ دونوں میں ہی اچھی سٹوڈنٹ سمجھی جاتی تھی، سو یہ ہنر کام آیا۔ ساتھ میں انگریزی تعلیم، بہت دل تھا اس کا نیشنل کالج آف آرٹس میں داخلہ لینے کا، حالات کی وجہ سے سیدھا سیدھا گریجویشن کر لی بس بیٹا! کیا کہیں، سب مقدر کے چکر ہیں۔ اب زود رنج ہو گئی ہے۔ رنگ رونق سے دلچسپی نہیں رہی۔ بہنوں کے کیے کا بھگتان بھگتنے کا ٹھانے ہوئے ہے۔ میں چاہتی ہوں گھر بار کی ہو جائے مگر نام نہیں لینے دیتی۔''

''ایک بات سمجھ میں نہیں آئی چی جان!'' ہمایوں نے اچانک موضوع بدلا۔ ''ماہین نے اس طرح شادی کی تو کیا نگین پر اس کے آفٹر ایفیکٹس کا اثر نہیں تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ماہین کی وجہ سے آپ لوگوں کو کیا کیا سننا اور دیکھنا پڑا۔ کیا اسے چاچان کی صحت کا اندازہ بھی نہیں تھا؟ اس نے یہی عمل کیوں دُہرایا، آپ نے اسے محتاط رہنے کی تلقین نہیں کی تھی؟''

''بس بیٹا! کیا کہیں..... کم بختی جب آئے اونٹ چڑھے کو کتا کاٹے، والا حساب ہوا۔ ابھی ماہین والے غصے سے سنبھلنے نہ پائے تھے کہ نگین نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔ کچھ سمجھ نہیں آیا کیا ہوا؟'' چی جان کے لہجے میں پچھتاوا تھا اور غم بھی۔

''اب وائنڈ اپ کریں امی! بہت ہو گیا گزرے دنوں کا ماتم'' کچن سے نگار پلیٹیں لیے نکلی اور کونے

میں رکھی ڈائننگ ٹیبل پر لگانے لگی۔

''کہاں کرتے ہیں ماتم بیٹا! یہ تو عرصے بعد کوئی اپنا نظر آیا تو نہ جانے کیوں زخم ادھڑنے لگے۔''

''آیئے ڈیئر گیسٹ، ڈنر از سرو ڈ'' اس نے اچھے میزبان کی طرح کہا۔

''لیکن چائے کے بعد اس کی تو گنجائش ہی نہ تھی'' ہمایوں نے گڑبڑا کر کہا۔

''ہم اس وقت ڈنر لے لیتے ہیں، عرصہ بعد آئے مہمان کی اچھی تواضع ہمارا فرض ہے کوئی خاص اہتمام نہیں دعوتِ شیراز ہے صرف۔''

''آؤ بیٹا! اب آ ہی گئے ہو تو ہم سفید پوشوں کا کھانا بھی چکھ لو'' چچی جان نے اٹھ کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

ہمایوں کو بالکل بھی بھوک محسوس نہیں ہو رہی تھی وہ محض ان کے اصرار پر کھانے کے لیے بیٹھا تھا۔ اس نے تکلفاً چند چمچ چاول اپنی پلیٹ میں ڈالے مگر وہ بہت سی باتوں کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس عالم تنہائی اور معاشی تنگی میں بھی وہ دونوں ماں بیٹی اپنی وضع داری کو مکمل طور پر قائم رکھے ہوئے تھیں۔ میز پر لگی کراکری اچھے دنوں کی یادگار تھی غالباً۔ کھانے کا انداز بھی اس وقت جیسا ہی تھا۔ ''سچ ہے وضع داری اور اعلیٰ نسبی دولت کی محتاج نہیں، وہ ان حالات میں بھی پکار پکار کر بتاتی ہے کہ دیکھو، یہ میں ہوں۔'' اس نے سوچا ''اور یہ وہ چیز ہے جو دولت سے خریدی نہیں جاتی۔''

کھانے کے بعد اسے واپسی کی فکر ہوئی۔ اچھی خاصی رات بیت چکی تھی۔ وہ چچی جان کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکلا تو اس نے محسوس کیا کہ گیٹ بند کرنے کے لیے آئی نگار کے چہرے پر عجیب سا تاثر تھا۔

''مجھے علم نہیں ہمایوں بھائی کہ آپ آج کے بعد بھی کبھی ملیں گے یا نہیں۔'' اس نے بلا جھجک کہنا شروع کیا ''مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ آج ہماری فیملی کے زوال کی کہانی سننے کے بعد آپ کی نظر میں ہماری کیا وقعت رہ گئی ہوگی اور آج کے بعد آپ یہاں آنا پسند بھی کریں گے یا نہیں..... مگر آپ.....'' پھر وہ جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئی۔ ہمایوں نے پورچ کی پیلی روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا۔ اس چہرے پر اسے آس و نراس کی سی کیفیت نظر آئی۔

''تم رک کیوں گئیں؟'' ہمایوں نے سکون سے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ اگر ممکن ہو تو آپ کبھی کبھار ہم سے ضرور ملا کیجئے گا۔'' پھر اس نے اضطراب کی کیفیت میں اپنے ہاتھ ایک دوسرے سے مسلتے ہوئے کہا ''مجھے عرصے کے بعد امی کے چہرے پر حقیقی خوشی کا ایک رنگ سا نظر آیا ہے ورنہ تو وہ خوش ہونا صرف ظاہر ہی کرتی ہیں۔'' ہمایوں نے کچھ دیر اسے غور سے دیکھا اور پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''تمہیں پتہ ہے نگار، میں نے زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال اتنے برق رفتار شیڈول کے ساتھ

گزارے ہیں کہ کبھی ایک لمحے کی فرصت بھی نہیں ملی۔ رکنے اور سوچنے کی کہ دراصل میں زندگی میں کیا مس کرتا ہوں مگر آج اس گھر میں آکر، تم سے اور چی جان سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ میں کیا چیز مس کرتا ہوں۔'' اس نے دیکھا نگار کے چہرے پر تجسس کا رنگ تھا'' مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ایسی ہی گھریلو زندگی، ایسا ہی گھریلو ماحول تو ہے جس کی کمی میں اپنے دل میں محسوس کرتا ہوں، ہماری زندگیاں بہت فاسٹ ہو چکی ہیں، ہم انسان نہیں ہیں کارڈلیس مشینیں ہیں، چلنا چلنا چلنا، کام کام، کام یہ ہمارا ماڈ (Mode) ہے مگر آج مجھے لگا جیسے عرصے بعد میں ایک ڈیجیٹل آلے کے بجائے ایک حقیقی گوشت پوست کے انسان میں کنورڈ ہو گیا ہوں۔ جیسے میں نے عرصے کے بعد سانس لیا ہے۔ میں جدید دنیا کے جادو کے حصار سے باہر نکل آیا ہوں۔ میں ان فیلنگز کو کھونا نہیں چاہتا۔ میں بار بار یہاں آنا چاہتا ہوں۔ بار بار تم لوگوں سے ملنا چاہتا ہوں خود کو یہ احساس دلانے کے لیے کہ میں ایک زندہ انسان ہوں روبوٹ نہیں۔''

''تھینک یو ہمایوں بھائی!'' نگار کو اس جواب کی یقیناً توقع نہیں تھی۔ وہ جیسے کسی انجانے خوف کے حصار سے باہر نکل آئی۔

''ہم لوگ حالات کی (Monotony) یکسائی سے دلبرداشتہ ہیں۔ میں آپ کی بے حد احسان مند ہوں جو آپ نے سارا کچھ سننے کے بعد بھی دیگر اعزا و اقارب کی طرح ہمیں اچھوت قرار نہیں دے دیا۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ یہ سارے جو حالات ہیں ان میں تمہارا یا چی جان کا کوئی قصور ہے۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ تم دونوں کا ہی بڑا حوصلہ ہے جو ان حالات میں بہادری سے زندگی کا سامنا کر رہی ہو۔'' اس نے دیکھا اس بات پر نگار کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ اسے یہ چمک اچھی لگی تھی۔ وہ اسی اچھے تاثر کے ساتھ اسے خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔

☆

ان دونوں ماں بیٹی سے یہ طویل ملاقات مزید ملاقاتوں کا ذریعہ بنی تھی اور وہ جواب قریب تھا کہ واپس چلا جاتا اسے یہاں رہنے میں مزہ آنے لگا۔ چی جان کی گفتگو ان کا رکھ رکھاؤ، ملنساری اور وضع داری اسے بچپن میں بھی فیسی نیٹ کرتی تھی اب یہ بات اور بھی فیسی نیٹ کرنے لگی تھی کہ اتنے سخت حالات میں بھی وہ ان سب کو مین ٹین کر رہی تھیں۔ وہ بلاتکلف ان کے گھر جانے لگا اور ان سے بیٹھا دیر دیر تک باتیں کرتا رہتا، فرمائش کر کے ان سے کھانے کی کوئی چیز بنواتا۔ اسے اپنائیت کے احساس کی شدت سے ضرورت تھی کیونکہ مدت سے وہ اس احساس سے محروم تھا اور چی جان کو اپنائیت کا احساس دینا چاہتا تھا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ انہیں بھی اس احساس کی ضرورت تھی۔ اس دوران اس نے اس لڑکی کا بھی بغور مشاہدہ کیا جو عمر میں بہت چھوٹی تھی مگر اپنی عمر سے کہیں بڑی ذمہ داریاں نبھا رہی تھی۔ وہ گھر کی معاشی سورس تھی، اندر باہر کے سارے کام نبٹاتی تھی۔ ماں کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی اور باہر کی دنیا میں جہاں کہیں سے بھی ملتی بہنوں کے

بارے میں اطلاعات بھی لیتی پھرتی تھی۔ وہ یہ باتیں گھر میں کسی کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے کبھی کبھی ہمایوں کو سنا دیتی۔

''نگین آپی کے دو بیٹے ہیں، وہ جو ہندو شوہر ہے اس کے ساتھ بھی گھٹ پٹ چل رہی ہے۔ اس نے ان کا نام رادھا رکھ چھوڑا ہے۔ یہی کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔'' ایک دن اس نے بتایا۔

''تمہیں کس نے کہہ دیا، کون سناتا ہے یہ سب باتیں تمہیں۔'' ہمایوں نے پرانی وضع کے صوفے پر لیٹے لیٹے ہنس کر پوچھا۔

''نگی آپی کی دوست ہے زارا پی آئی اے میں..... ائیر ہوسٹس ہے۔ آج کل اس کا روٹ بھی یہی ہے۔ وہ ملتی رہتی ہے ان سے جب جاتی ہے.....''

''اور آ کر تمہیں سناتی ہے۔'' ہمایوں نے ایک بار پھر ہنس کر کہا ''یہ باتیں وہ خود آ کر سناتی ہے تمہیں یا تم پوچھنے جاتی ہو؟''

''آپ کمال کے انسان ہیں ہمایوں بھائی جہاں انسان کا انٹرسٹ ہو وہاں کانٹیکٹ تو وہ رکھتا ہے نا!'' وہ برا مان کر بولی۔

''اچھا یہ بتاؤ ان دونوں نے ایسا کام کیا جو اخلاقی، مذہبی اور شرعی لحاظ سے غلط تھا، بہت لبرل ہو جاؤ تو یہ بھی چھوڑو ان کے جس فعل نے باپ کی جان لے لی۔ اس کے بعد بھی تمہارا انٹرسٹ ہے۔'' وہ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''آپ کے بقول آپ کے بہن بھائی اپنی زندگیوں اور اپنے بچوں میں مگن ہیں، آپ سے ان کا رابطہ صرف فون پر ای میل پر یا پھر کبھی کبھار دو بدو ملاقات تک محدود ہو گیا۔ آپ کے بقول آپ شروع ہی سے اپنے بہن بھائیوں سے مختلف تھے اور اس طرح کی بکھری زندگی اور سیٹ اپ آپ کو کبھی پسند نہیں رہے تھے۔ ٹھیک ہے نا۔'' جواباً وہ سنجیدگی سے بولی۔ ہمایوں نے دانتوں میں ٹوتھ پک بھیرتے ہوئے سر ہلایا۔

''تو پھر کیوں ان کے بارے میں ذرا سی خبر بھی آپ کی توجہ پکڑ لیتی ہے۔ پرسوں ہی آپ بتا رہے تھے کہ اسد بھائی کے بیٹے نے گریجویشن کر لیا ہے۔ آپ خوش تھے۔''

''اس لیے کہ وہ میرا بھتیجا ہے اور اس کی کامیابی میرے لیے خوشی کا باعث ہے۔'' ہمایوں نے وضاحت کی۔

''تو پھر یہی نظریہ مجھ پر کیوں اپلائی نہیں ہو سکتا۔ ناخن سے ماس جدا ہوا کبھی بتائیے؟'' ہمایوں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا مگر چی جان کو دیکھ کر خاموش ہو گیا۔ وہ باہر سے آئی تھی۔ ان کے ہاتھ میں پکڑی ٹوکری میں کچھ ہرے ہرے سے پتے تھے۔

''اتنی دیر سے چننے کی کوشش کر رہی تھی۔ مشکل سے یہ ملی۔'' انہوں نے پتوں کو پکڑ کر گلے میں ڈلی

زنجیر کے ساتھ بندھی عینک آنکھوں پر جما کر ان کا معائنہ کرتے ہوئے کہا ''چولائی کا ساگ ہے، کبھی بہت اچھا لگتا تھا اب تو عرصہ ہوا نظر نہیں آتا۔ آج باہر دیکھا تو لگا گھاس میں اُگا کھڑا ہے سو چن لائی۔'' انہوں نے اطمینان کر لینے کے بعد ان دونوں کو بتایا۔

''باہر گھاس ہے لان میں یا جھاڑ جھنکاڑ ہے جس میں سے آپ یہ چن لائیں۔'' ہمایوں نے مذاقاً کہا۔

''اے بیٹا، کون کرے اس جھاڑ جھنکاڑ کی صفائی، ہم دونوں سے تو ہوتی نہیں۔ مہترانی جو آتی ہے اسے کئی مرتبہ کہا اپنے آدمی کو شام کو بھیجنا کر دے دو مرتبہ آیا دو ہاتھ مارے اور شیخی بھگارنے لگا۔ یہ کیا وہ کیا سب جڑی بوٹی وہیں کی وہیں تھی۔ یہاں کام کرنے والوں کا ٹہل نہ نکوری، لاؤ مجوری مجوری والا حال ہے۔ مالی رکھنے کا پتہ نہیں ہم میں سولان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے ہم نے۔'' وہ چڑ کر بولیں۔

''کیا..... کیا بولیں آپ.....'' ہمایوں کو ان کی گفتگو میں شامل محاورات بہت اچھے لگتے تھے۔ سو فوراً پوچھا۔

''امی کا مطلب ہے کہ کام وام کرتے نہیں، معاوضہ مانگنے بیٹھ جاتے ہیں۔'' نگار نے وضاحت کی اور اٹھ کر ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔

''چی جان، میں جتنی مرتبہ آیا ہوں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ نگار آج کل کی لڑکیوں سے بالکل مختلف ہے۔ میں نے یہاں دیکھا ہے لڑکیاں اب اپنے بارے میں بہت کانشس ہو چکی ہیں، مجھے لگتا ہے کہ سڑکوں پر، دفتروں میں ہر جگہ نظر آنے والی ہر لڑکی خود کا بہت خیال رکھتی ہے، سادگی تو بہت کم دیکھی ہے میں نے لیکن سادہ لڑکیاں بھی بہت مین ٹینڈ محسوس ہوتی ہیں۔ جب پہلے ہم یہاں رہتے تھے۔ اس وقت ایسا نہیں تھا تب ہمارے بڑے تبصرہ کیا کرتے تھے۔ فلاں لڑکی اچھی شکل کی ہے۔ فلاں نہیں اب تو ایسا موازنہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ شاید اچھا نظر آنے کے سارے لوازمات کم و بیش ہر لڑکی کی رسائی میں ہیں پھر یہ نگار کیوں خود سے اتنی بے پروا ہے۔ اس کی عمر تو بہت کم ہے۔ میرا خیال ہے بائیس تیئس سال ہو گی بشکل، مگر بوڑھوں والا حلیہ بنائے رکھتی ہے۔'' ہمایوں دل میں یہ سوچتے ہوئے بھی کہ شاید اسے یہ بات ایسے منہ پھاڑ کر نہیں کرنی چاہیے تھی۔ وہ برا بھی مان سکتی تھیں کہ وہ کون ہوتا تھا ان کی بیٹی کے بارے میں یوں تبصرہ کرنے والا، اپنی صاف گوئی سے مجبور بول اٹھا تھا۔ چی جان نے جواب میں اسے غور سے دیکھا اور پھر ٹھنڈا سانس لیا۔

''بس بیٹا اپنے مزاج سے مجبور ہیں۔ اپنے حالات کا تو یہ حال ہے کہ زحل کی نحوست کے چھٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ بندہ کپڑے دیکھے کہ پاؤں۔ بہتیرا کہتی ہوں بیٹا جو پہنو اوڑھو ڈھنگ سے پہنو، مگر ایسا دل اٹھایا ہے اس نے کہ بس کیا کہوں۔ تمہارے چاچا جان کی پنشن آتی ہے اس ملک میں بیوہ کی پنشن ہوتی کیا ہے، کچھ یہ کماتی ہے، کچھ کبھی بھیّوں (بھائیوں) کو خیال آئے تو بھجوا دیتے ہیں۔ ایک گھر کا خرچہ اور گزارا مشکل ہے پھر جب حسب منشا کچھ کر نہ سکے نا آدمی یونہی دور اندیشی پر اتر آتا ہے۔ کوئی ساتھی کوئی دوست

کہتی ہے ''نگار السحر'' فلاں فنکشن پر آنا، فلاں جگہ جانے کا پروگرام ہے ضرور آنا۔ نہیں جاتی بس سوچ کر کہ جب دل ہی نہیں کہیں جانے کو تو کیا جانا۔ اب یہی تو غم ہے میری زندگی میں کہ اس کی زندگی کا رنگ کیونکر بدلوں۔ بدشوق، گھر گھسنی زود رنج ہوتی جا رہی ہے مگر میں بے بس ہوں۔'' ہمایوں ہونٹوں پر انگلی رکھے غور سے سن رہا تھا۔

''میں سوچ رہا ہوں چچی جان کہ کچھ دن اس نئے لاہور کو ایکسپلور کیا جائے۔'' نگار کو کمرے میں آتا دیکھ کر اس نے قدرے بلند آواز میں کہا'' لاہور کی تو شکل بدل کر رکھ دی۔ انتظامیہ کی بدمذاقیوں نے، کیسی عمارتیں، کوٹھیاں ہوا کرتی تھیں اس شہر میں سب گرا کر یہ اسکائی اسکریپرز کھڑے کر دیئے، میں تو یقین جانیے راستے بھول بھول جاتا ہوں۔ اب سوچ رہا ہوں کہ ایک ''سفر لاہور شہر کا'' کروں، مگر مجھے گائیڈ نہیں مل رہا۔ یار لوگوں کو تو اتنی فرصت ہی نہیں اور کسی سے شناسائی اس حد تک بڑھی ہی نہیں کہ اس سے یہ فرمائش کر سکوں، بتائیے کیا کروں؟''

''یہ تو ہے بیٹا، اس شہر کے سارے مزاج ہی بدل گئے میں تو خود کبھی کسی بہت ضروری کام سے باہر جاؤں تو جی الجھنے لگتا ہے۔ اس شہر کی وضع داری ختم ہو گئی ہے۔ اب تو لگتا ہے۔ بندروں کے گلے میں موتیوں کی مالا ڈالنے کا رواج ہو رہا ہے یہاں۔'' چچی جان نے ساگ چنتے ہوئے کہا۔

''آپ نے میرا مسئلہ تو حل کیا نہیں، قسم سے اتنے دنوں سے گھوم رہا ہوں گاڑی لے کر عرصہ پہلے بڑے شوق سے کسی سڑک پر گھومتے ہوئے ابا بتاتے تھے یہ زیبا محمد علی کی کوٹھی ہے، کسی اور روڈ پر یہ ملکہ ترنم کی کوٹھی ہے کیا گریس ہے بھئی اور کہیں بتاتے یہ ملکہ پکھراج کی کوٹھی ہے۔ دیکھو کیسے رنگ برنگے مور رکھے ہیں خاتون نے ہماری خالہ مرحومہ بہت شوقین تھیں فلموں کی اور فلموں کے اداکاروں کی مداح جی بھر کے۔ وحید مراد کی موت پر کیسا زار زار روئی تھیں۔ شاید یاد ہو آپ کو۔ اس کے بعد وہاں بھی جب ملاقات ہوئی خواہش ہی کرتی رہیں اب کہ پاکستان گئی تو وحید مراد کی قبر پر ضرور جاؤں گی، پچھلی مرتبہ گئی تھی تو ڈھونڈی تھی ملی نہیں۔''

''اے ہاں بیٹا بہت شوقین مزاج تھیں مرحومہ۔'' چچی جان کے لہجے میں تلخی تھی ''ایک مرتبہ جب یہاں آئیں تو ماہی، منگی والی بات پر جی بھر کر کوسا انہوں نے مجھے، بولیں بی بنو مبارک ہو، بھائی اعجاز کی نسل بیٹیوں سے تو خیر کیا چلنی تھی، پھر بھی جو آگے پوتا ہو گی رنگ برنگی اور غیر مذہبی ہو گی کوئی یہودی ہو گا کوئی سکھ کوئی ہندو پھر بڑے شوق سے بولیں۔ ہماری تو بھئی بہویں بھی پاکستانی داماد بھی اور سب کے سب مسلمان، اب سنا ان کا پوتا کسی لڑکی کے ساتھ رہتا ہے بغیر شادی کے وہاں اور نواسہ ہم جنس پرست بن چکا ہے۔ خوب رنگ ہیں دنیا کے۔''

''خیر۔'' ہمایوں کو اندازہ نہیں تھا کہ گفتگو اتنی تلخ ہو جائے گی، اسے لگا جیسے ان کی خالہ کی ساری

بدزبانی اس کے کھاتے میں چلی گئی ہو۔ اس نے موضوع بدلنے کو مشق کی ''ہم بات کر رہے تھے۔ وحید مراد کی قبر کی۔''

''بات قبر کی بھی تھی۔'' چی جان ایک دم ذرا ہنس کر بولیں ''اس وقت جب آئی تھیں تو بولیں میں تو وہاں ہی مروں گی میری لینڈ میں وہاں مسلمانوں کا قبرستان بہت خوبصورت ہے، گلاب کے پودوں سے سجا، خوبصورت قبروں والا، میں تو کبھی پاکستان میں دفن نہ ہونا چاہوں گی، قسمت ایسی کہ یہاں آئیں بیٹی کی نسبت طے کرنے بیمار ہوئیں بیٹے صلاح مشورہ کر رہے تھے کہ مر گئیں تو یہیں دفن کر دیں گے۔ میں نے دبے لفظوں ان کی بات دہرائی تو شاید لے گئے تھے ساتھ۔''

''ہاں واپس جا کر چند دن ہی ہاسپٹل میں رہیں اور پھر ختم ہو گئیں۔'' ہمایوں نے بتایا ''شاید ان کی خواہش پوری ہونی تھی، بہرحال آپ نے تو میرا مسئلہ حل نہیں کیا میں خود ہی کہتا ہوں، نگار تم میری گائیڈ بنو گی ''ایکسپلورلاہور'' کے سفر میں۔'' اس نے براہِ راست نگار کو مخاطب کیا۔

''میں!'' وہ حیرت سے بولی ''ارے چھوڑیں ہمایوں بھائی، میں تو صرف ایک یا دو راستے جانتی ہوں۔ گھر سے سیدھا سکول یا پھر شاید قریبی مارکیٹ اور سارے راستے بھول چکی ہوں۔''

''جب سڑک پر نکلو گی تو سب یاد آجائے گا، بولو کب تمہیں لینے آؤں۔ میں ڈیڑھ بجے آف ہو جاؤں گا آفس سے سیدھا تمہارے سکول پہنچ جاؤں گا۔ گھر سے لے لوں، کیوں چی جان؟''

اسے محسوس ہوا وہ متذبذب تھیں مگر پھر انہوں نے نہ جانے کیا سوچ کر سر ہلا دیا ''ٹھیک ہے بیٹا تم چلی جانا، کل سکول سے ہی لے لینا اس کو گھر آنے جانے میں وقت ہی ضائع ہو گا۔''

''مگر امی، یہ کیسے ممکن ہے، آپ کیا کریں گی اتنی دیر۔'' نگار نے احتجاج کیا۔

''ٹھیک ہے بیٹا جہاں آدھا دن گزرتا ہے۔ اکیلے وہاں تھوڑا اور گزر جائے، کوئی بات نہیں تم ضرور جاؤ۔'' ان کے چہرے پر امید کی پرچھائیں لرز رہی تھی۔ ہمایوں نے آنکھ چرالی۔

☆

جس وقت وہ نگار کے بتائے ہوئے پتے پر سکول پہنچا ابھی سکول کی چھٹی نہیں ہوئی تھی۔ یہ ایک پرانی وضع کی بڑی سی کوٹھی تھی جس میں سکول بنایا گیا تھا۔ اونچی چھتوں اور سیمنٹ کے فرشوں والی کوٹھی۔ اسے یہ ماحول اچھا لگا۔ وہ پلے گراؤنڈ میں ایک سائیڈ پر رکھے بینچ پر بیٹھ گیا۔ کسی کلاس میں بچوں کو میوزک سکھایا جا رہا تھا۔ میوزک ٹیچر کی دلکش آواز آ رہی تھی۔ وہ کی بورڈ کی کیز دباتی ایک ہی لائن کو دہرا رہی تھی۔ ہمایوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ بالکل ہی مختلف شخصیت رہتی ہو گی، اس لڑکی کی یہاں۔ اسے وہاں تقریباً آدھا گھنٹہ انتظار کرنا پڑا جب چھٹی کی گھنٹی بجی۔ کچھ دیر بعد اس نے دیکھا چھوٹے بچوں کو لائن میں باہر لے کر آتی نگار بالکل مختلف لڑکی لگ رہی تھی۔ انتہائی سنجیدہ اور سمجھدار، ذمہ داری سے بچوں کو گیٹ تک پہنچاتی۔ وہ اٹھ کر

اس کے پیچھے چلا گیا۔

''آپ تو سچ مچ آ گئے۔'' اس نے سیاہ فائل سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''تم مذاق سمجھ رہی تھیں؟'' وہ مسکرایا اور سن گلاسز لگاتا باہر چلا۔ وہ اس کے پیچھے آ گئی۔

''ایک بات بتائیں ہمایوں بھائی۔'' گاڑی میں بیٹھنے کے بعد جب وہ گاڑی مین روڈ پر لایا تو وہ بولی۔

''پوچھو۔''

''آپ جو آپ دراصل ہیں، اپنی شخصیت کے بالکل برعکس ہمارے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہیں؟'' اس کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

''کیا مطلب شخصیت سے برعکس؟'' اس کا مطلب سمجھ جانے کے باوجود اس نے دانستہ کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ ایک بالکل مختلف دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ جدید اور پر آسائش دنیا، جو ہماری دنیا سے بالکل مختلف ہے بالکل میچ نہیں کرتی۔ ہماری آپ کی زندگیاں، پھر آپ ہم پر اتنے ایکسٹرا مہربان کیوں ہیں۔ یہ بات ایک دو دفعہ کے بعد سے مجھے ہضم نہیں ہو پا رہی۔'' اس نے اب کے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔

''بات دراصل یہ ہے کہ نگار بی بی کہ تم لوگوں کے ساتھ لوگوں نے جو سلوک کیا ہے اس کی روشنی میں تمہارا سوال بالکل جائز ہے۔ تم لوگوں نے جو رویے فیس کیے ہیں اور جیسی جمود کی زندگی تم لوگ اب اتنے سالوں سے گزار رہے ہو وہاں میرا یہ رویہ واقعی ہضم نہیں ہونا چاہیے، مگر قصہ یہ ہے کہ تمہاری طرح میں بھی اتنے سال کامپلیکسڈ رویوں کا شکار رہا ہوں۔ جب یہاں سے گیا تو ایکسائٹمنٹ تھی نئی دنیا دیکھنے کی، وہاں پڑھنے کی، پڑھ لیا، دنیا بھی دیکھ لی، نوکری بھی مل گئی، پیسے بھی کمائے گئے مگر اس سارے کے دوران بہت کچھ کھو گیا، سب کچھ اس تہذیب میں مدغم ہو گیا۔ میں تمہیں بتاؤں کہ وہ سارے جو میرے اپنے ہیں بہت خوش ہیں وہاں مگن ہیں۔ وہ بھول چکے ہیں کہ وہ کون ہیں، کہاں سے متعلق ہیں وہ وہی ہو گئے ہیں جہاں وہ رہتے ہیں۔ مگر میرا مسئلہ کچھ اور ہے، میں وہاں رہتے ہوئے، ویسے ہی رہتے ہوئے بھی خود کو بے جگہ اور غیر متعلق محسوس کرتا رہا۔ بے شمار تعلقات ہیں بے شمار دوستیاں ہیں مگر تنہائی کا احساس ہے۔ یقین جانو کہ وہ چیز جس کی کمی مجھے محسوس ہوتی تھی اس کی تلاش میں ہر سالانہ چھٹی پر دنیا کے مختلف کونے گھومتا رہا دیکھتا رہا وہ شاید وہاں، شاید یہاں مگر نہیں ملی پھر پاکستان آ گیا۔ سب نے مذاق بھی اڑایا اور خود بھی یہاں آ کر پچھتاتا رہا تھا کہ وہ تو یہاں بھی نہیں ہے مگر تمہیں اور چچی جان سے مل کر اتنے سالوں میں مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اس ختم ہوئے ماحول اور دم توڑتی تہذیب کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے اس کی تلاش تھی جو تمہارے ہاں اس زبوں حالی میں بھی پوری طرح موجود ہے۔ سو میں نے سوچا جب تک یہاں ہوں کیوں نہ اس ماحول میں چند گھنٹے گزار لوں۔ میری جاب کی نوعیت اور ہے میرا شیڈول بھی ٹف ہے مگر جب ذرا موقع ملتا ہے تمہارے یہاں جا دھمکتا

ہوں۔ تمہیں برا لگتا ہے تو بتاؤ آئندہ نہیں آؤں گا۔ ویسے یہ بتا دوں کہ اپنائیت کے احساس کو زندہ رکھنے کے لیے اسٹیٹس اور پیسہ جدید یا قدیم زندگیاں وغیرہ وغیرہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں، یہ تو بس جہاں مل جائے اسے پانا چاہیے۔ حاصل کرنا چاہیے، محسوس کرنا چاہیے، اس کے لیے کوئی قربانی دینا پڑے تو وہ بھی دے دینی چاہیے۔ ویسے تمہیں اس شہر میں کونسی جگہ سب سے اچھی لگتی ہے۔''

''جب میں چھوٹی تھی اور ابا میاں کے ساتھ سیر کا پروگرام بنتا تھا تو میں ہمیشہ ایک ہی جگہ جانے کی فرمائش کرتی تھی اب تو مدت ہوئی ادھر کا رخ کیے ہوئے۔''

''وہ کون سی جگہ ہے؟'' ہمایوں نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

''کامران کی بارہ دری، مجھے وہ جگہ بہت پسند ہوا کرتی تھی۔''

''ہاں، مجھے بھی کچھ کچھ یاد ہے راستے کے بارے میں گائیڈ کرو گی۔'' ہمایوں نے مسکرا کر کہا۔

''ضرور، اگر خود صحیح یاد رہ گیا ہو تو۔'' وہ بھی جواباً مسکرائی۔

''وہ بہت عرصے کے بعد یہاں آیا تھا۔ دریائے راوی کی یادیں کہیں کہیں ذہن میں باقی تھیں۔ شاید ایک آدھ بار وہ بھی کبھی یہاں آئے تھے۔ اس نے دیکھا شہر کی انتظامیہ نے اس جگہ کو بھی بہت حد تک ٹھیک ٹھاک کر دیا تھا۔ کامران کی بارہ دری رینوویٹ ہو چکی تھی۔ راوی کا پانی کم ہوتے ہوتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اس کے اپنے ابا راوی کو ''بڈھا دریا'' کہا کرتے تھے، لگتا تھا بڈھا دریا اپنی عمر ختم کر چکا تھا یا پھر آخری دموں پر تھا۔ اس نے نگار کی طرف دیکھا۔ وہ بھی یقیناً ماضی کی کسی یاد میں کھوئی ہوئی تھی۔

''یہ جگہ کبھی سلطنت کے شہزادوں کی پسندیدہ جگہ رہی ہوگی، اس کی شان اور سج دھج کے منظر ہی کچھ اور ہوں گے۔ تاریخیں مٹ کر آثار قدیمہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ جواب ہم اتنی ماڈرن دنیا میں رہتے ہیں نا ہمایوں بھائی، یہ ماڈرن دنیا بھی اپنے اگلے ادوار میں داخل ہو کر آثار قدیمہ بن جائے گی ہے نا؟'' اس نے عمارت کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''ہاں۔'' ہمایوں نے آہستہ آواز میں کہا۔ وہ اس ماضی کے فسوں میں کھویا ہوا تھا۔

''بس اتنی ہی حقیقت ہے انسان کی اور دنیا کی، پھر بھی ہم کس کشاکش میں پڑے ہوئے ہیں۔'' وہ دکھ سے بولی۔ کچھ دیر اس جگہ گزار کر وہ واپسی کے لیے گاڑی میں بیٹھے ''تمہیں بھوک لگ رہی ہوگی، تم سیدھا اٹھ کر سکول سے میرے ساتھ آ گئی ہو؟'' ہمایوں نے گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اب گھر جا کر ہی کھاؤں گی کھانا، پلیز اب آپ یہ مت کہیے گا چلو کہیں سے لنچ کر لیتے ہیں، مجھے اس طرح کی فارمیلیٹیز سے سخت چڑ ہے۔'' وہ ناک چڑھا کر بولی۔

''میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا، کیونکہ مجھے بھی اس طرح کی فارمیلیٹیز سے سخت چڑ ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا ''ہاں البتہ تمہاری برداشت اگر ساتھ دیتی ہے تو چلو ایک چکر شاہی قلعے اور بادشاہی مسجد کا بھی لگا لیں۔ قریب

آئے ہوئے ہیں۔'' جواب میں وہ خاموش رہی۔ شاہی قلعے کا راستے اسے یاد تھا اور یہ کچھ اتنا بدلا بھی نہ تھا۔

''اس کی دیکھ بھال لگتا ہے اس پیمانے پر نہیں ہوئی جیسی ہونی چاہیے تھی۔'' ہمایوں نے ناقدانہ نظروں سے قلعے کے مختلف حصے دیکھتے ہوئے کہا۔

''دیکھ بھال!'' وہ ہنس کر بولی۔ ''یہاں تو بڑی بڑی تقریبات منعقد ہوتی ہیں، ثقافتی میلے منائے جاتے ہیں، میگا ڈرامے سٹیج کئے جاتے ہیں۔ خدا جانے بادشاہوں، شہزادوں بلکہ شاید ان کے غلاموں کنیزوں تک کی روحیں کتنا تڑپتی ہوں گی اس صورتحال پر۔''

''وہ خوش بھی تو ہو سکتے ہیں، ان کا چھوڑا ورثہ آئندہ آنے والی نسلوں کے کتنے کام آ رہا ہے۔'' ہمایوں نے بات کا مثبت پہلو ڈھونڈ کر کہا۔

''چھوڑیں ہمایوں بھائی، وہ کیسے بلند انا، وضع دار، خود پرست لوگ تھے۔ ایسی حرکتیں جو یہاں ہوتی ہیں دیکھ کر تو وہ بیک جنبش قلم گردنیں اڑا دینے کا حکم دے دیا کرتے تھے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''تو یوں کہو نا کہ ان کی روحیں اس لیے تڑپتی ہوں گی کہ وہ بے بس ہیں موت کے حصار میں ورنہ ان جدید لوگوں کی گردنیں اڑا دینے کا حکم دے دیتے۔'' ہمایوں نے قلعے کے ایک جھروکے کی سطح پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''کیا آج کے آرکیٹیکٹ عمارتیں بناتے ہیں، جو اس زمانے کے معماروں نے بنا دیں، اس ترقی یافتہ ٹیکنیکل زمانے کے انجینئرز بھی نہیں تھے اس وقت مگر ذرا دیکھیں ہر چیز میں کتنی پرفیکشن ہے، ان کا ایئر کنڈیشنگ اور ہیٹنگ سسٹم دیکھئے کیا بات ہے۔'' نگار نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' ہمایوں اس شاندار عمارت کی حالت سے قدرے مایوس تھا ''میں نے دہلی کا لال قلعہ بھی دیکھا ہے، آگرہ کا تاج محل، فتح پور سیکری کی مغلیہ عمارتیں۔ انڈیا میں تو جگہ جگہ ایسی عمارتوں کے نشان ملتے ہیں مگر افسوس ان کو سنبھالنے کا انتظام بہت برا ہے۔ یہی عمارتیں کہیں کسی ترقی یافتہ ملک میں ہوتیں تو ان کی ظاہری حالت قابل دید ہوتی۔''

''وسائل بھی تو دیکھیں نا ان ترقی پذیر ممالک کے۔'' نگار نے ایک جھروکے سے نیچے سڑک پر چلتی ٹریفک کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مائنڈ یو نگار، ترقی یافتہ قومیں اپنے لیے وسائل خود پیدا کرتی ہیں، میں تقریباً تمام دنیا دیکھ چکا ہوں، وہاں میں نے دیکھا قومی ورثے سے ان کے ٹورازم ڈیپارٹمنٹس نہ صرف ان کی دیکھ بھال کا خرچ نکالتے ہیں بلکہ ملک کی اکانومی میں بھی حصہ ڈالتے ہیں، مگر یہاں.....'' اس نے سر ہلایا ''نہیں میں کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میں یہاں آ کر معاشرے کی اخلاقی، ذہنی، معاشرتی اور معاشی پستی دیکھ دیکھ کر مایوس ہوتا ہوں۔ آئی ایم سوری، بٹ آئی ایم ٹوٹلی ڈس اپائنٹڈ۔''

''میرا خیال ہے اب چلتے ہیں، ورنہ ممکن ہے آپ کی مایوسی مزید بڑھ جائے۔'' وہ یوں مسکرائی جیسے زبردستی مسکرا رہی ہو۔ مزار اقبال پر فاتحہ پڑھنے کے بعد وہ لوگ واپس جانے کے لیے مڑے۔

''تم کسی ہوٹل وغیرہ میں کھانا نہیں کھاؤ گی، مگر میرا دل چاہ رہا ہے کہ چچی جان کے لیے کچھ لے جائیں، اس لیے تم بیٹھو میں آتا ہوں۔'' اس نے شیزان کے سامنے گاڑی کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ اس نے سر ہلایا اور آنکھوں پر سن گلاسز چڑھا لیے۔ جب وہ اسنیکس وغیرہ کے پیکٹ اٹھائے باہر آیا اس نے دیکھا وہ بدستور اسی پوزیشن میں بیٹھی تھی جیسے وہ چھوڑ کر گیا تھا۔ اسی سمت دیکھتے ہوئے جہاں اس کے اندر جانے پر دیکھ رہی تھی۔ اس نے دروازہ کھول کر پیکٹ پچھلی سیٹ پر رکھے اور اسے مخاطب کیے بغیر گاڑی سٹارٹ کر دی۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے چچی جان پان کی بھی بہت شوقین ہوا کرتی تھیں، اب تو میں نے کبھی ان کے ہاتھ میں سروتا اور چھالیا اور ان کے سامنے پاندان نہیں دیکھا۔'' مولا بخش کے سامنے گاڑی کھڑے کرتے ہوئے اس نے اسے ایک مرتبہ پھر مخاطب کیا۔ اس نے ایک گہرا سانس لے کر چہرہ موڑ لیا۔ ہمایوں نے ہارن بجا کر دکان کے چھوٹے کو پان لانے کے لیے کہا۔ تیز آواز میں بجتے ٹیپ ریکارڈر پر کوئی دہائی دے رہا تھا۔ قمیض تیری کالی.....سوہنے پھلاں والی ''یہ کلچر کا حال ہے۔'' ہمایوں نے تاسف سے سر ہلایا ''ہر کھوکھے پر، ہر ٹھرّے پر ٹی وی لگے ہوئے ہیں اور انتہائی فحش سین چل رہے ہوتے ہیں۔ ہر ماجا گاما بیٹھا آنکھیں سینک رہا ہے۔ معصوم سادہ لوح لوگ کہاں ہوتے ہیں مجھے تو کہیں نظر نہیں آئے۔''

''آپ کس زمانے کے منظر دیکھنا چاہتے ہیں ہمایوں بھائی۔'' بالآخر اس نے اپنی خاموشی توڑی ''ان چند سالوں میں دنیا نے جتنی تیزی سے ترقی کی ہے، اس کا کچھ اثر تو یہاں بھی ہونا تھا۔ کلچر بھی ترقی کر رہا ہے، ٹیکنالوجی بھی، لوگوں کی سوچ بھی، آپ کس بات سے ناراض ہیں۔ چھوٹی قوموں کا بڑی قوموں نے ناطقہ بند کر رکھا ہے اتنی سی خوشی بھی نہ منائیں وہ، اتنی سانس بھی نہ لیں وہ، کمال کرتے ہیں آپ لوگ.....''

''او کے!'' ہمایوں اس کے تیور دیکھ کر مصلحت آمیز انداز میں بولا ''تم ناراض مت ہو، میں اپنی فیلنگز کا اظہار نہیں کروں گا۔'' پھر راستے بھر گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔

''دیکھیں امی، ہمایوں بھائی کیا کیا اٹھا لائے، بھلا کوئی تک ہے، ہم کونسا ایسی چیزوں کے عادی ہیں، ہم تو بھائی سیدھی سادی خوراک کھاتے اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔'' گھر پہنچ کر اندر داخل ہوتے ہی وہ ماں سے مخاطب ہوتی دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ ہمایوں کو محسوس ہوا اس کے لہجے میں بلا کی تلخی تھی۔

''خواہ مخواہ میں ناراض ہو رہی ہے، میں تو اپنا گھر سمجھ کر چند چیزیں لے آیا۔ چچی جان یہ اتنی ناراض کیوں رہتی ہے؟'' اس نے ان کے سامنے بیٹھتے ہوئے شکوہ کیا۔

''ٹھیک ہی تو کہتی ہے بیٹا، سر گاڑی پاؤں پہیہ کر کے روپیہ کماتے ہو، سوچ سمجھ کر خرچ کرنا چاہیے۔'' انہوں نے بے اختیار بیٹی کی حمایت کی۔

''سرگاڑی پاؤں پہیہ۔'' اس نے دُہرایا اور بے اختیار مسکرا دیا ''میں سخت ناراض ہونے والا تھا۔ آپ کے اس محاورے نے ہنسا دیا، ویسے لگتا ہے آپ مجھے اپنا کچھ نہیں سمجھتیں۔ ہاں ہے بھی تو بہت دور کا تعلق، رشتہ تو سرے سے ہے ہی نہیں۔''

''یہ بات تو ہرگز مت سوچو بیٹا، تم جانو جب سے آنے لگے ہو، میرا دل راضی راضی رہتا ہے، اس گھر میں بھی کسی کے بولنے چالنے کی آواز آنے لگتی ہے ورنہ تو ہم ماں بیٹی زندگی سے بالکل کٹتے ہی جا رہے تھے۔ حالات کا مجھ بڑھیا پر کیا اثر ہونا تھا قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہوں، آج ہوں کل نہیں، ہاں اس بچی پر ناحق ظلم ہوا، اسی لیے چڑچڑی اور بدمزاج ہو رہی ہے۔ اپنے تئیں لوگوں کے اس الزام کو دھو رہی ہے کہ ماں باپ کی تربیت میں کمی ہوتی تو یہ بھی اڑن چھو ہو چکی ہوتی، مگر اس سارے میں زندگی برباد کر رہی ہے۔'' ان کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

''ایک تو اس سارے میں اس گھر کی ہر چیز سے ٹپکتی وحشت اور زبوں حالی کا شدت سے ہاتھ ہے، لان دیکھیے جھاڑ جھنکاڑ، دیواریں دیکھیے ان پر گھاس اگ رہی ہے، کائی زدہ ہو رہی ہیں۔ ہر چیز توجہ چاہتی ہے، آپ اجازت دیں صبح ہی میں بندے بھجواتا ہوں، اس گھر کی حالت ذرا درست کریں، دیکھیے اپنا کہا ہے تو انکار مت کیجیے گا۔'' ہر چیز سے ڈپریشن ٹپک رہا ہے، ایک بار اس کی حالت درست ہونے دیں، دیکھیے گا آپ لوگوں کی سوچ پر کتنا اثر ہوتا ہے۔''

''اتنے سال تھوڑا تھوڑا بچا کر کچھ پس انداز کیا ہے نگار کے لیے، اسی وجہ سے گھر کی حالت درست کرنے کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اب تم اصرار کرتے ہو تو یہ بچایا ہوا پیسا گھر پر لگا دیتے ہیں۔'' چچی جان نے تخت پوش سے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ مسکرا دیا اسے ان کی صرف اجازت کی ضرورت تھی۔

☆

''ہومی، تم اب کیا ادھر ہی بیٹھے رہو گے، اب تک تنگ نہیں پڑے۔'' یہ مینا آپا تھیں جو اسے فون پر ڈانٹ رہی تھیں ''تمہارا دل کیسے لگ گیا آخر وہاں؟''

''نوکری کی بات ہے آپا، کوئی خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔'' اس نے جمائی روکتے ہوئے کہا۔

''سب پتہ ہے مجھے، تم نے خود کہہ کر خود کو وہاں پوسٹ کروایا ہے۔ تمہاری ساری عمر کی فینٹیسیز نہ گئیں، بھلا رکھا کیا ہے وہاں جسے دیکھنے تم گئے ہو وہاں، جو جاتا ہے ایسی خوفناک تصویر کھینچتا ہے اس ملک کی کہ رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔''

''اور یہاں کے لوگوں کے سامنے ایسا خوفناک نقشہ کھینچا جاتا ہے اس جہانِ اول کا جو مسلمانوں کے لیے وہ اب بن چکا ہے کہ ان کے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔'' اس نے طنز سے کہا۔

''ہاتھ نہ پہنچے تھو کڑوی والی بات ہے۔'' وہ نخوت سے بولیں جو اسے خاصا برا لگا۔

''چلیں چھوڑیں، کوئی اور بات کریں۔''

''تم کس ٹائم پر آن لائن ہوتے ہو، میں وہاں ہی بات کرلوں گی تم سے۔'' وہ ناراض ہوئیں۔

''ٹھیک ہے، آپ پاکستان کے ٹائم کے مطابق رات بارہ بجے کے بعد سائن ان کرسکتی ہیں۔'' اس نے بات ختم کی۔ وہ ان سارے رشتوں سے دل میں ناراض تھا۔ اسے اب اندازہ ہورہا تھا کہ وہ سب کم یا زیادہ چاچا جان کے حالات سے بہرحال واقف تھے۔ وہ ان سب کی بے حسی پر پریشان تھا، مایوس اور ناراض بھی۔ اور یہ وہ فیملی تھی، جو جب عروج پر تھی تو دور و نزدیک کے یہ سارے رشتے دار فائدہ بھی اٹھاتے تھے اور ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام بھی کرتے تھے۔ خود یہ مینا آپا، اسے یاد آیا، ان کے لندن جانے کے سلسلے میں ساری بھاگ دوڑ چاچا جان نے ہی کی تھی۔

''کبھی کے دن بڑے، کبھی کی راتیں۔'' اسے چچی جان کی بات یاد آئی۔ کیسی وضع دار خاتون ہیں، چاہیں تو سو لوگوں پر احسان جتا کر کام نکلوا سکتی تھیں، مگر احسان مندی کا یارا انہیں تھا۔ اس نے ان کے گھر کی وضع قطع درست کروانے کا کام شروع کروایا تو پچھواڑے میں بنے سٹور روم سے جو بیش قیمت اور نایاب سامان نکلا، اس نے اسے دنگ کر دیا تھا، کشمیری نخ دان، ایرانی غالیچے، سیتل پاٹی پر بنی سبزیاں، ساگوانی صندوق، آرائشی مجسمے، بیش قیمت پوستینیں، نادر آرٹ کے نمونے، آبدار تلواریں، ساگوان کا فرنیچر، قیمتی برتن، بلجیم کٹ گلاس کے فانوس، کٹ گلاس کے واٹر سیٹ، انگلش اور فرنچ کراکری۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس قدر قیمتی سامان ایک عارضی چھت کے کمرے میں پھینکے یہ دونوں ماں بیٹیاں کیسی ویران و بے آباد زندگیاں گزار رہی تھیں۔

''ہاں ہیں، یہ بھی۔ تمہارے چاچا جان کئی ملکوں کے سفارتخانوں میں تعینات رہے، جگہ جگہ گھر بنایا، سامان خریدا، کچھ سامان میرے والد کی طرف سے ملا تھا مجھے، بس ایسی عقل خراب ہوئی کہ کچھ ہوش نہیں، کیا سامان تھا کیا رکھا۔'' چچی جان سے بات کی تو وہ بے نیازی اور سادگی سے بولیں۔

''آپ کو علم ہے کہ یہ چیزیں کتنی نایاب اور بیش قیمت ہیں، آپ ایک دفعہ آکشن میں چند چیزیں رکھیں۔ ان سے آنے والی رقم سے آپ کی باقی کی ساری زندگی سہل اور آسائش کے ساتھ گزر جائے گی۔'' وہ شدید حیرت کے عالم میں چیخا۔

''مرنے والوں کی یادوں اور بزرگوں کی نشانیوں کو کون نیلام کرتا ہے بیٹا، یہ کرلیں تو پھر عزت کونسی بڑی بات تھی جو نیلام ہوئی اور ہم سہنے کے لیے باقی رہ گئے۔'' انہوں نے عینک اتار کر دوپٹے کے پلو سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔

''اپنی ہاؤ، اب یہ چیزیں اس گھر میں سجا لیجئے۔ وہاں پڑے پڑے تو خاک ہو جائیں گی نشانیاں اور یادیں۔'' اس نے ایک چھوٹے پیانو کی کیز دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ایک بیش قیمت بلیئرڈ ٹیبل جس

کا قیمتی کپڑا چوہوں کی نظر ہو چکا تھا اس نے اٹھوا کر ٹھیک کروانے بھیج دی۔ گھر کا لان اور پودے درست ہو چکے تھے۔ گھر کی مرمت کا کام تقریباً مکمل تھا۔ اب اس کو ڈسٹمپر کروانے کا کام رہ گیا تھا۔ اس سارے کام کے دوران نگار السحر قطعی غیر متعلق رہی تھی، یوں گویا اسے یہ سب پسند نہ آ رہا ہو، مگر اس نے بھی پروا نہ کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔

☆

اس روز وہ کئی دن کے بعد اس گھر میں آیا تھا، اسے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ گھر کی وحشت اور ویرانی ختم ہو چکی تھی۔ گیٹ بھی مرمت ہو چکا تھا، دیواریں اور در نئے رنگ لیے جگمگا رہے تھے لان سلیقے سے سجا تھا۔ بیرونی برآمدے میں کین کی کرسیاں اور میز جو سٹور کے خزانے سے نکلیں، رکھی تھیں۔ برآمدے کے ستون پر گملے میں اگی رات کی رانی کی بیل گول چکر میں بندھی تھی۔ وہ دبے قدموں اندر چلا آیا۔ چچی جان اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی تسبیح کے دانے گرا رہی تھیں۔ ان کے ساتھ کمرے میں صنف نازک سے تعلق رکھنے والی ایک اور شخصیت بھی تھی۔ جب سے وہ یہاں آ رہا تھا ان دونوں ماں بیٹیوں کے علاوہ تیسرا بندہ اس نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ مارے تجسس کے آگے بڑھا، یہ منظر اس کے لیے قطعی نیا تھا۔ وہ نگار کی تقریباً ہم عمر لڑکی تھی۔ سانولے رنگ اور تیکھے نقوش والی۔ اس کے بال سیاہ اور دراز تھے، اس نے شوخ رنگوں کے پرنٹ والا کاٹن کا سوٹ پہن رکھا تھا جس کی سلائی عمدہ تھی، اس نے ہلکا میک اپ بھی کر رکھا تھا، مجموعی طور پر یہ شخصیت جاذب نظر تھی۔ ہمایوں نے ملک ملک کا پانی پی رکھا تھا، ہر عمر، ہر مزاج، ہر رنگ کی خاتون دیکھ رکھی تھی۔ اب تو وہ تجربے کے اس حصے میں تھا جہاں ایک نظر میں پوری شخصیت کا جائزہ لے سکتا تھا۔ اس گھر کی ترتیب نو کے ساتھ زندگی کا یہ شوخ رنگ اس کی آنکھوں کو بھلا بھی لگا تھا۔

''یہ ہمایوں ہے۔'' چچی جان نے اس کے سلام کے جواب میں دعا دے کر سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس شخصیت سے اس کا تعارف کروایا۔

''آپ کے وہ بھتیجے جو بالآخر اس گھر کو نکھارنے میں کامیاب ہوئے۔'' وہ زیر لب مسکرا کر بولی۔

''اور یہ ماہ رخ ہے۔'' چچی جان نے اس لڑکی کا تعارف کروایا ''اس کی بھتیجی نگار کے سکول میں پڑھتی ہے، ابھی حال ہی میں انہوں نے پچھلے بلاک میں گھر خریدا ہے۔ کبھی کبھار آ جاتی ہے اپنی بھتیجی کے بارے میں کچھ پوچھنے پچھانے، نگار کی کلاس فیلو بھی رہ چکی ہے۔''

''میں تو آنٹی سے کہہ رہی تھی کہ اب اس گھر کا رنگ ڈھنگ بدلا ہے تو ٹریٹ بھی دیں۔ گھر تو نیا نہیں مگر ایک طرح کی ہاؤس وارمنگ ہو سکتی ہے۔ یاد ہے آنٹی ہم نے جب گھر خریدا تو بھائی جان نے کتنے بڑے پیمانے پر ہاؤس وارمنگ پارٹی دی تھی، آپ لوگ تو آئے نہیں مگر اب تک لوگوں کی زبان پر اس کے چرچے ہیں۔'' وہ ایک ادا سے بولی تھی۔ ہمایوں نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ لڑکی خاصی خوش شکل تھی اور

اچھا پہن اوڑھ کر اور بھی اچھی لگ رہی تھی۔

”نہ جانے کتنے مقروض ہوئے ہم اس سارے میں، اب پارٹیوں کے نمٹے کون پالے بیٹا۔“ چچی جان فطری سادگی سے بولیں۔ ”اتنے انمول خزانے کو سینے سے لگائے بیٹھی رہیں اور عسرت کی کہانیاں سناتی رہیں۔“ ہمایوں نے دل میں سوچا۔

”چلیں چھوڑیں، آپ سنائیں ہمایوں صاحب آپ کہاں رہ رہے ہیں آج کل۔ میں نے ایک روز نگار سے کہا تھا تمہارے ہینڈسم کزن سے کس روز ملاقات ہوگی، دیکھئے آج ہو ہی گئی۔“

”ہینڈسم کزن......! یہ نگار نے بتایا آپ کو میرے بارے میں۔“ وہ چونکا۔

”نہیں، میں نے ایک روز آپ کو ادھر آتے دیکھا تھا۔ خود اس روز کہا تھا۔“ وہ ایک ادا سے مسکرا کر بولی۔ اس کے بعد وہ دیر تک بیٹھی رہی اور اس نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ اس دوران چچی جان تسبیح ہی میں مشغول رہی تھیں اور نگار کو خدا جانے کس مصروفیت نے گھیر رکھا تھا جو وہ یہاں نظر نہیں آئی تھی۔ شاید اسے ماہ رخ سے گفتگو کرنا اچھا لگ رہا تھا یا نگار کے ذکر کو نظر انداز کرنا۔ وہ دیر تک ماہ رخ کی گفتگو سنتا رہا، جو زیادہ تر اپنی دولت، اسٹیٹس اور نو خرید شدہ گھر کے متعلق ہی تھی اور اس شام جب وہ چچی جان سے رخصت ہوا اس وقت اس کے پاس ماہ رخ کا دیا دعوت نامہ بھی تھا، جو اس کے کسی بھائی کی فیکٹری کے افتتاح کا تھا۔

☆

نگار السحر ایک زود رنج، کم آمیز اور بے نیازسی لڑکی تھی۔ اس کے گھر کے حالات نے اسے زندگی کے ہر رنگ سے منہ موڑے رکھنے کا سبق سکھایا تھا۔ اس نے انتہائی آسودہ بچپن اور لڑکپن گزارا تھا، مگر جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کے گھر پر ناگہانی ٹوٹ پڑی۔ اسے شوق، مرضی، پسند قسم کے سارے لفظ بھول گئے اور ساری توانائیاں رزق کمانے اور شکستہ دل ماں کی دل جوئی میں صرف ہونے لگی تھیں۔ عزیزوں، رشتے داروں، دوستوں، ملنے جلنے والوں کے رویوں نے اسے اس قدر دل برداشتہ کر دیا تھا کہ اس نے سوائے انتہائی ضروری کام کے کسی سے ملنا اور گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ماں کے شان دار پس منظر، راج دھانی اور آن بان سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے خود سے زیادہ اپنی ماں کی شکست پر دکھ ہوتا تھا۔ اس نے رہی سہی عزت بچانے کی خاطر زندگی گزارنے کا انتہائی دشوار گزار راستہ اپنایا تھا اور اس پر ثابت قدمی سے چل رہی تھی۔ اس کے اسی مزاج کی وجہ سے بہت سے لوگ اس سے اجتناب کرتے تھے اور اس کے حلقہ احباب میں بھی بہت کم لوگ تھے۔ یہ سب اسی طرح چلتا رہتا مگر اس کی اچانک ملاقات ہمایوں سے ہوگئی جو اس کی چچی کا بھانجا تھا۔ عرصہ ہوا کسی عزیز رشتے دار نے ان سے ملنا چھوڑ رکھا تھا۔ ایسے میں ہمایوں کا معمول سے ہٹ کر خلوص اور برتاؤ اسے عجیب سا لگتا تھا، مگر وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی ماں پر ہمایوں کی آمد نے بہت مثبت اثر ڈالا تھا۔ وہ اکثر اٹھتے بیٹھتے اس کا ذکر کرتی تھیں اور اسے دعائیں بھی دیتی تھیں۔ ایک رات اپنے دل کے انتہائی

گہرے گوشے میں اسے ایک نئی سوچ کے پنپنے کا احساس ہوا اور اسے خیال گزرا کہ وہ اپنے راستے سے ہٹ رہی تھی۔ وہ اپنے نئے احساس کو جھٹکنے کی خاطر بے نیازی کا چولا اوڑھ کر بیٹھ گئی اور اس نے خود کو بے وجہ مصروفیات میں الجھا لیا۔ وہ دانستہ ہمایوں کی آمد پر اس سے ملنے سے کترانے لگی تھی۔ اسے گھر کی آرائش، زیبائش کروانے کا کام پسند نہیں آ رہا تھا۔ اس میں اپنے باپ والی خودداری بدرجہ اتم موجود تھی۔ اسے کسی کا زیر بار ہونا اور اس سے بڑھ کر ہمایوں کا معمول سے بڑھ کر اپنے گھر کے معاملات میں دخیل ہونا بھی پسند نہیں آ رہا تھا، مگر یہاں بھی وہ ماں کی وجہ سے خاموش تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا کہ شاید زندگی کے عرصے سے جامد پانی میں ہونے والی ہلچل اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی، شواس نے کچھوے کی طرح سر اندر گھسا لیا تھا۔ اس روز وہ اپنی ڈائری میں میوزک کے نوٹس بنا رہی تھی جب امی نے ہمایوں کا ذکر چھیڑ دیا۔

''بہت دن ہوئے وہ آیا نہیں، یہ ٹیلی فون لگوا گیا تھا کہ آپ چاہیں کریں نہ کریں، کوئی دوسرا تو کر لے آپ کو فون مگر خود کبھی فون بھی نہیں کیا۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔

''مصروف ہوں گے۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔

''کل شام جب ماہ رخ آئی تھی تمہیں پنکی کی آرٹ بک دکھانے، بتا رہی تھی اکثر ملاقات ہوتی رہتی ہے اس کی ہمایوں سے۔'' ان کے لہجے میں تفکر تھا۔

''ہوتی رہتی ہوگی۔'' وہ بدستور اپنے کام میں مصروف بولی۔

''کیا جوڑ بنتا ہے ماہ رخ کے ساتھ، تیسرے محلے سے نکلی میں تیرے چچا کی بیٹی۔'' وہ خفا ہوئیں۔

''امی جان، آج کل یہی دور چل رہا ہے، تیسرے، چوتھے بلکہ دسویں محلے سے نکل کر بھی تعلق بن جاتے ہیں۔ آپ کیوں ناراض ہو رہی ہیں۔'' اس نے پہلی مرتبہ سر اٹھا کر کہا۔

''آنے لگا تھا، چلو رونق ہو جاتی تھی، اتنی اپنائیت جتاتا تھا، میں نے سوچا کہ شاید ہمارے بھی دن پھرے۔ کیا علم تھا کہ ماہ رخ کے بھائیوں کا کالا دھن یوں کھینچ کر لے جائے گا۔'' ان کے چہرے پر دکھ ہویدا تھا۔

''مایا کو مایا کھینچتی ہے، آپ جو ہر وقت انہیں اپنے تنگ ہاتھ، اقتصادی مسائل اور مشکل حالات کے قصے سناتی رہتی تھیں۔ وہ سوچتے ہوں گے ان فقتوں سے کب تک ملا جائے۔ بندہ وضع داری ہی نبھاتا ہے، چار دن آئے تھے انہیں واپس چلے ہی جانا تھا۔ ضرور تھا کہ اپنے خیالات کے بخیے ادھیڑ ادھیڑ انہیں سنایا جاتا۔ وہ تو آپ کے شان دار ماضی سے ہی واقف تھے۔ آپ نے کوئی بھرم نہیں رہنے دیا۔'' نگار کا لہجہ تلخ ہوا۔

''ہر ایک کو تو نہیں سنائے جاتے یہ قصے، اپنا سمجھ کر سنائے تھے، اپنائیت جو جتاتا تھا اور شاندار ماضی کی وضع داری تو ہمارے حال سے ظاہر ہو جاتی ہے سنانے کی کیا ضرورت ہے۔ تیر نہ کمان کا ہے کے پٹھان، مجھے شیخیاں مارنے کی کیا ضرورت تھی۔'' وہ بھی جواب میں بگڑیں ''ہاں تم خود کے بارے میں ضرور سوچو۔ آخر

ہزاروں لڑکیوں سے ملتا ہوگا ہمایوں اپنے کام میں، اپنے سرکل میں، یہ ماہ رخ تمہاری عمر کی ہی ہے، تمہارے واسطے سے اسے ملی، اس میں کیا خاص بات تھی جو انگلی سے لگا ساتھ لے گئی۔ وہ یہاں آتا تھا تو تمہاری خشک طبیعت اور درویش حلیے کا گلا اکثر کرتا تھا، اسی سے تنگ آ کر ادھر کا راستہ بھول گیا وہ۔ مجھ بڑھیا سے کتنی دیر گفتگو کیا کرتا وہ۔

''میرا حلیہ، میرا مزاج۔'' نگار نے ڈائری پٹخ کر کہا۔ ''آپ ہمیشہ غیر حقیقی باتیں بنایا کیجیے میرے بارے میں، میں ماہ رخ کی طرح ہو سکتی ہوں بھلا بتائیے۔ اگر میں ویسی ہونے لگی نا تو سب سے پہلے آپ ہی مجھے طعنہ دیں گی، واہ واہ میاں بانکے، تیرے گلے میں سوسوٹانکے۔ مجھے زبان چلائے کی روٹی کھانے کی عادت نہیں ہے۔ کوئی خوش دلی سے آتا ہے سو بار آئے نہیں آتا تو ایک ہزار بار نہ آئے۔'' وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی ''اور آپ بھی سن لیجیے، وہ جو پیسے بینک میں سنبھال کر رکھے بیٹھی ہیں نا، صبح ہی چیک سائن کر کے دیجیے گا، ہمایوں صاحب کا قرض چکا دیں گے۔'' اس نے سر جھٹک کر کہا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

''چیک لکھ کر دے دوں۔'' ماں نے تسبیح کے مزید چند دانے گرائے ''اور مستقبل.....'' مستقبل جو خوفناک بھتنے کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے ناچتا رہتا تھا، ان کی سوئی پھر مستقبل پر اٹک گئی ''کیا بنے گا آنے والے وقت میں، ہاتھ پیریوں ساتھ چھوڑتے جاتے ہیں، لڑکی کا کچھ بنتا دکھائی نہیں دیتا۔ یہ لڑکا آنے لگا تھا۔ زبردستی اس کی تنہائی سے باہر نکالنے لگا تھا، باہر گھمانے لے جانے کا اصرار کرنے لگا تھا۔ دل میں سوچا شاید مولا کوئی تدبیر نکالنا چاہتا ہے ورنہ کہاں گمان تھا کہ دیورانی جی کا بھانجا یوں اچانک آ دھمکے گا۔ بات پہ بات، اس سے چھیڑ چھاڑ، بات چیت کرتا تھا، دل کو امید لگی تھی کہ شاید اس گھر میں بھی تو ہنسنے (شادی کا شگون) کے دن آئے ہیں، پر جی کہاں وہ ماہ رخ ایسی ٹکرائیں کہ لے اڑیں لڑکے کو، ادھر کا ہوش ہی نہیں رہا۔ کیا باتیں کرتا تھا، میں ہوں نہ آپ کا اپنا، چھوڑیں، بھول جائیں کہ سب نے آپ کے ساتھ کیا کیا، مجھے سمجھیں نا اپنا بیٹا۔ پر جی وہی حساب ہوا کہ یوسف ہزار خرید۔ ایسے اچھے گنوں کا لڑکا تو سب ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ ماہ رخ کے گھر والے ٹھہرے نو دولتیے، ان کو تو عزت بنانے کے لیے ایسا داماد کہاں سے ملے گا، مگر تف ہے بھئی، ہمایوں کیسے برداشت کرتا ہوگا ان نو دولتیوں کی چھچھوری حرکتیں اور چھچھوری باتیں۔ ماہ رخ اور ان کا خاندان اچانک ہی اگا زمین سے۔ کہیں پہلے تو کبھی دولت نہ دیکھی ان کے ہاتھ، یہ نگار کے ساتھ ہی تو پڑھتی رہی۔ بس جی بندر کو ملی ہلدی کی گرہ، پنساری بن بیٹھا والا حساب ہے، آج کل زمانہ ہی ان لوگوں کا ہے۔'' وہ شدتِ صدمہ سے دیر تک بیٹھی یونہی اوٹ پٹانگ باتیں سوچتی رہیں۔ انہیں علم ہی نہیں ہوا کب باہر شام اتری اور اندھیرا کمرے میں بڑھنے لگا۔ ان کو اس سوچ سے کمرے میں روشن ہونے والی ٹیوب لائٹ نے چونکایا۔ انہوں نے سامنے دیکھا ہمایوں سوئچ بورڈ کے پاس کھڑا تھا۔

''کیا بات ہے، یوں بے خبر کیوں بیٹھی ہیں۔ نہ باہر کا گیٹ لاکڈ ہے نہ یہاں کمرے کا دروازہ.....''

وہ مسکراتا ہوا ان کی طرف آتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ آج اس ساری گفتگو کا اثر تھا کہ اس کو دیکھنے کی ان کی نظر ہی بدل گئی تھی۔ وہ چمک اور خوشی مفقود ہوئی جو اسے دیکھ کر آنکھوں اور دل میں اتر آتی تھی۔

''ہاں میاں بس ایسے ہی۔'' انہوں نے سر جھکا کر سامنے رکھا رسالہ بند کیا۔

''بڑی خاموشی ہے بھئی۔'' وہ ان کے سامنے کرسی پر بیٹھے رہنے کے بعد بالآخر بولا۔ پچھلے پانچ سات منٹ سے خاموشی چھائی تھی۔ وہ دونوں ہی کچھ بول نہیں رہے تھے۔

''نئی بات تو نہیں ہے یہاں تو خاموش ہی رہتی ہے۔'' وہ بے رخی سے بولیں۔

''کیا بات ہے چچی جان، ناراض ہیں۔'' وہ فوراً محسوس کر گیا۔

''میں کیوں ناراض ہونے لگی بھلا۔'' وہ بدستور آنکھیں جھکائے بیٹھی تھیں۔

''میرا خیال تھا کہ آج میں یہاں آؤں گا تو آپ سخت ڈانٹیں گی مجھے، ناراضی کا اظہار کریں گی، کہیں گی کہ اتنے دن کہاں رہا، فون نہیں کیا وغیرہ وغیرہ..... مگر آپ کا ردِعمل تو بالکل مختلف ہے، غیر متوقع۔'' وہ بولا۔

''ارے بھئی میں سوچتی ہوں کہ کیا ناراضی کا اظہار کروں، تم آتے ہو سر آنکھوں پر، جب نہیں آتے یقیناً کوئی وجہ ہوئی ہوگی۔'' وہ آنکھیں اب بھی اٹھا نہ پائی تھیں۔

''تو پوچھیے نا کہاں رہا میں۔'' وہ اپنائیت سے بولا اور پھر ان کی بدستور خاموشی بھانپ کر خود ہی بولا ''مجھے پہلے اسلام آباد اور پھر کراچی جانا پڑا کام کے سلسلے میں اور کل شام ہی میں واپس آیا ہوں، واپس آیا تو مجھے لگا کہ میں آپ لوگوں سے اتنا ہی اداس ہوا ہوں جتنا کوئی بہت اپنوں سے ہوتا ہے، سو آج آفس ہوتے ہی سیدھا ادھر چلا آیا ہوں۔'' ایک منٹ میں چچی جان کے دل سے سارے گلے شکوے دھل گئے۔ ''اے یہ نگار تو وسوسے ڈالنے کی ماہر ہے۔ کیسا میرا دل بچے سے بُرا کیا۔'' وہ کھل اٹھیں اور پھر اس کے بعد ان کی گفتگو بھی نارمل ہوگئی۔

''کیا وقت ہوگیا آج میں اپنی رسٹ واچ بھی بھول آیا۔'' کافی دیر کے بعد ہمایوں نے سر اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا ''آپ نے کوئی وال کلاک بھی نہیں لگایا ہوا یہاں۔''

''ہم لوگوں کے لیے وقت ایک سا ہی رہتا ہے، نہ بھی دیکھیں تو کیا فرق پڑتا ہے۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔

''ایک روز جب میں ماہ رخ کے ہاں ڈنر پر انوائیٹڈ تھا، مجھے وقت اور گھڑی کی اہمیت کا خوب احساس ہوا۔ کمال لوگ ہیں وہ بھی، ہر کمرے کی دیوار پر، کسی کارنر ٹیبل پر اور نہ جانے کہاں کہاں مختلف کلاک اور ایسی گھڑیاں سجا رکھی ہیں جو پندرہ پندرہ منٹ گزرنے کا اعلان کرتی ہیں فل والیوم میں، انسان کو احساس ہونے لگتا ہے وقت گزر رہا ہے۔ مجھے تو کئی مرتبہ لندن کا بگ بین یاد آگیا۔'' وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ ان کے دل میں ایک ٹیس سی پڑی۔

''تم گئے اس کے یہاں؟'' انہوں نے اچانک پوچھا۔

''کئی مرتبہ۔'' وہ مسکرایا ''بڑے دلچسپ لوگ ہیں وہ گھر کیا ہے لگتا ہے کوئی طلسم خانہ ہے، لگتا ہے بہت دولت ہے ان کے پاس۔''

''اور نئی نئی آئی ہے۔'' وہ لہجے کی چبھن چھپا نہ سکیں ''چاہے کسی کو تلوار کی سی لگے میں تو کہوں گی کہ دولت بے شمار آئی ہے برتنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ اس لڑکی کی باتوں سے تو مجھے یہی محسوس ہوتا ہے۔'' وہ بے اختیار ہنس دیا۔

''کل پھر ان کے ہاں ڈنر ہے، مختلف لوکل چینل ان کا گھر لیتے رہتے ہیں ڈراموں کی شوٹنگ کے لیے، یہ بخوشی دے دیتے ہیں، مفت میں گھر کی نمائش ہو جاتی ہے۔ ساتھ میں زبردست قسم کا ڈنر ہوتا ہے، میوزیکل نائٹس مناتے ہیں بڑے زندہ دل قسم کے لوگ ہیں۔'' چی جان کا دل جلنے لگا۔

''ارے ہاں، میں تمہیں چیک لکھ دیتی ہوں، بھیا خود ہی کیش کرا لینا۔ تمہارے قرض دار خوب ہوئے ہم اس گھر کو ٹھیک کرنے کے سلسلے میں۔'' ان کا ردِعمل زبردست تھا۔

''ارے..... رے'' وہ جو بازو سر کے پیچھے باندھے بڑی آرام دہ پوزیشن میں بیٹھا تھا سیدھا ہوتا ہوا بولا ''یہ آپ کو قرض اور چیک کہاں سے یاد آ گیا اچانک..... میں نے آپ سے کیا کہا تھا۔'' اس کے لہجے میں تنبیہ تھی۔

''وہ تو ٹھیک ہے بیٹا تمہارے منہ کا اگال ہمارے پیٹ کا ادھار ہے پر زندگی کا کیا بھروسہ ہے آج ہیں کل نہیں، جان پر بوجھ لے کر ساتھ کیوں جائیں۔''

''اچھا.....'' وہ سوچ میں پڑا ''لایئے دیجیے چیک کہاں ہے؟'' انہوں نے نگار کو آواز دی۔ ہمایوں نے دیکھا وہ اپنے مخصوص اکتائے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوئی تھی۔ اس کے بال بھی الجھے ہوئے تھے جیسے کب سے لیٹے لیٹے اٹھ کر آئی ہو اور اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ اس کی آنکھیں متورم اور سوجی ہوئی لگ رہی تھیں۔

''کیسی ہیں مس میوزک ٹیچر۔'' وہ خوش دلی سے بولا۔ ''حسبِ معمول سب فضول ہے۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''چی جان کل ماہ رخ کے ہاں ڈنر پر نگار کیوں نہ چلے میرے ساتھ۔'' اسے ایک اور سوجھی۔

''مجھے کوئی شوق نہیں ہے تقریبات اٹینڈ کرنے کا اور وہ بھی بن بلائے۔'' وہ سختی سے بولی۔

''بن بلائے کیوں بھئی۔ مجھے ان لوگوں نے کہا تھا کہ ایک دو مہمان ساتھ لا سکتا ہوں۔ تم ضرور چلنا نگار، ان کا ''جہاں نما'' انجوائے کریں گے۔ اس روز تاریخی عمارتوں کے وزٹ پر تمہارے تبصرے بے حد جان دار تھے۔'' وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔

''آپ ہی کو مبارک ہو ایسے لوگوں کی میل ملاقات اور ان کی تقریبات، مجھے معاف رکھیے۔''

''تم ہر بات پر منع کرنے بیٹھ جایا کرو۔'' چی جان کا مایوس دل ایک بار پھر اٹھنے لگا تھا ''تم ضرور اس

کو ساتھ لے جانا ہمایوں، اس کو تو عادت ہے انکار کرنے کی۔''

''اور دیکھیں الٹی بات کر رہی ہے۔ آپ کو مبارک ہو ایسے لوگوں کی میل ملاقات، وہ تو مجھے یہاں ہی ملی تھی نگار کے توسط سے، یہ اور بات کہ ان کی فیملی کو مختلف عہدوں پر کام کرنے والوں سے کام پڑتے رہتے ہیں اور پڑتے ہی جاتے ہیں سو فدوی کو ان لوگوں نے نہ جانے کس لحاظ سے وی آئی پی کا درجہ دے دیا ورنہ میں تو تمہارے ناطے سے ہی شناسا ہوا ان لوگوں سے۔''

''ایک تو آپ کو نہ جانے کیا الٹی سوجھنے لگی ہیں۔'' ہمایوں کے جانے کے بعد وہ ماں سے الجھ گئی

''آپ کیوں حامی بھر نے بیٹھ گئی تھیں، مجھے کہیں نہیں جانا۔''

''مت زرہ بکتر ڈالو اس قدر اپنے اوپر کہ تمہارا اپنا دم گھٹنے لگے۔ زندگی خالہ جی کا گھر نہیں ہے مس صاحبہ، اس کو بہتر طریقے سے گزارنے کے لیے کوشش کرنا پڑتی ہے۔'' وہ بھی درشتی سے بولیں۔

''ایسی ہی دو عدد کوششیں آپ کی بڑی صاحبزادیوں نے بھی تو کی تھیں۔ ان سے ناراض کیوں ہیں اب تک۔'' وہ تنک کر بولی۔

''حق ہے تمہارا کہہ لو مجھے باتیں، جہاں دنیا کلیجہ چھلنی کرتی ہے وہاں ایک تم بھی سہی۔ اچھا تمہارا جو دل چاہے کرو، میں اصرار نہیں کروں گی۔'' ان کا گلا رندھ گیا۔ نگار نے بے بسی کے عالم میں لمبا سانس کھینچا۔

''میں تمہیں کیسے سمجھاؤں میری ماں کہ جو تم چاہتی ہو ایسا ممکن نہیں ہے۔ اس گھر میں تو اہنے کا سوچنا ہی غلط ہے۔ زمانہ ہمیں ناکردہ کے جرم میں مسترد کر چکا پھر یہ ہمایوں جو گھڑی پل کو آتا ہے تو صرف وقت گزارنے کیونکہ تھوڑا آرتھوڈکس اور قدامت پرست واقع ہوا ہے، مگر کیا وہ ہمارے حالات نظر انداز کر سکتا ہے، قطعی نہیں، یہ سوچ ہی غلط ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے سوچ رہی تھی ''نہ جانے یہ مختصر سب واپس جائے گا، کسی کے آنے کے احساس کی خوشی کے تحت اسے گھر تو لے آئی مگر عقدہ یہ کھلا ہے کہ اچھر بھلی جامد زندگی میں امید وہم کے بھنور اٹھنے لگے ہیں جو سراسر رہے ہے سکون کو تباہ کر دینے پر تلے ہیں۔''

☆

''تمہیں پتہ ہے میرا ماہین اور نگین سے رابطہ ہوا ہے۔'' اس رات ماں کی خوشی کی خاطر جب وہ تیار ہو کر ماہ رخ کا ڈنر اٹینڈ کرنے ہمایوں کے ساتھ گاڑی پر بیٹھی تو ہمایوں نے اسے بتایا۔

اس کا دماغ ایک مسلسل کشمکش کی زد میں تھا، گاڑی سے اٹھتی ایئر فریشنر اور ہمایوں کے لباس سے اٹھتی قیمتی پرفیوم کی خوشبو اس کے اس کھولتے دماغ پر چھا رہی تھی۔ اسے اس جملے کی سمجھ نہیں آئی ''میں نے ان لوگوں کا ای میل ایڈریس ڈھونڈا اور اب باقاعدگی سے گفتگو ہوتی ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''کن لوگوں سے۔'' اس نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

''جنت کے دروغاؤں سے۔'' وہ جھلا کر بولا ''ارے بھئی میں ماہین اور نگین کی بات کر رہا ہوں۔''

''مگر آپ نے کیوں کیا ان سے رابطہ۔'' اسے وجہ سمجھ نہیں آئی۔

''میں نے سوچا دیکھوں تو سہی، دو تہذیبوں اور دو قسم کے مذاہب میں ڈھلی زندگیاں کیسی گزرتی ہیں۔'' وہ جواب میں خاموش رہی، اسے ایک عجیب قسم کی تذلیل کا احساس ہوا۔

''نگار تم میں اور تمہاری بہنوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ انہیں اپنے کیے پر کوئی پشیمانی نہیں بلکہ ان کا کہنا ہے کہ وہ ان حالات سے جو تم لوگوں پر گزرے، بچ گئیں اور یہ کہ ان کا مقسوم ہی وہ تھا انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔''

''تو ان کے حال کی فکر کس کو ہے۔'' اس نے جل کر کہا۔ ''میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہم ان کا ذکر بھی نہیں کرتے۔''

''میں نے ان سے صرف یہ دیکھنے کے لیے رابطہ کیا کہ شاید ان کو کوئی پچھتاوا ہو، شاید وہ دوبارہ رابطہ کرنا چاہتی ہوں مگر جھجک میں کر نہ پائی ہوں۔ مجھے مانی نے بتایا تھا کہ نگین خاص طور سے کوئی خاص سیٹلڈ زندگی نہیں گزار رہی۔ اس لیے رابطہ کیا تھا میں نے ان سے، مگر شاید انسان ایک بار گناہ کی دلدل میں پاؤں پھنسا بیٹھے تو اس کا نکلنا کسی معجزے کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔''

''اچھا تو آپ اس قسم کی باتیں سنانے مجھے ساتھ لے آئے، میں بھی کتنی احمق ہوں جو آ گئی۔'' نگار نے کڑھ کر دل میں سوچا۔ ماہ رخ پہلے بھی اسے کئی بار اپنے گھر بلا چکی تھی مگر وہ اپنی کم آمیز طبیعت کی وجہ سے کبھی نہیں گئی، ویسے ماہ رخ کا برتاؤں اس کے ساتھ ہمیشہ اچھا ہوتا تھا مگر اس روز ہمایوں کے ساتھ اسے آتا دیکھ کر نگار کو محسوس ہوا وہ کچھ چپ سی ہو گئی تھی اور اس نے کوئی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ بھی نہیں کیا تھا۔ نگار کو مزید پچھتاووں نے گھیر لیا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ ہمایوں کی حیثیت وی آئی پی کی سی تھی۔ بہت سے لوگ اس کے شناسا تھے۔ اسے بہت سی جانی پہچانی شخصیات بھی نظر آئیں، فلم، ٹی وی سے متعلق شخصیات، سیاست دان اور نہ جانے کون کون'' آپ دیکھتیں تو سہی کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔'' اس نے دل میں مخاطب کیا۔ ایسے کئی منظر میرے ابا جان کی زندگی میں ہمارے گھر میں سٹیج ہوئے، تب ایسے ہی لوگ بچے بچے جاتے تھے مگر یہ سب مایا کا کھیل ہے، کل وہاں تھا آج یہاں ہے۔ اس نے ماہ رخ کا طلسم کدہ نما گھر بھی پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ گھر کے انٹیریئر اور ایکسٹیریئر پر بے تحاشہ پیسہ صرف کیا گیا تھا مگر اس کے نزدیک وہ گھر بدمذاقی کی ایک عمدہ مثال تھا۔ اس نے ہنستے مسکراتے ہمایوں کو دیکھا۔ ''مگر شاید تمہیں یہی پسند ہے، تم دل کے بہت اچھے ہو مگر دل کی ترجیحات بھی تو ہوتی ہیں۔''

اس نے پہلی مرتبہ اس کے بہت اچھے ہونے کا اعتراف کیا۔ پھر وہ ماہ رخ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا اس کی طرف آیا۔

''نگار! تم اکیلی کیوں بیٹھی ہو۔ یہاں کوئی تو تمہارا شناسا ہوگا؟'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''نگار اور میں اکٹھے پڑھتے رہے ہیں۔ پھر نگار کی اسٹڈی چھوٹ گئی یونو اس کی بہنوں والی ٹریجڈی۔ نگار تمہاری اس بہن کا کیا حال ہے، جس نے کسی بودھ سے یا پھر شاید آگ پوجنے والے سے شادی کر لی تھی اور اب غالباً کسی ہندو کے پاس رہتی ہے؟'' ماہ رخ نے مسکراتے ہوئے ایک ادا سے اس کی حیثیت اور حقیقت بیان کرنے کی سعی کی۔ نگار کے چہرے پر تاریک سایہ سا لہرا گیا۔ ہمایوں اس صورتِ حال پر دل میں پچھتایا کہ وہ ماہ رخ کو اس طرف کیوں لے آیا تھا۔

''ماہ رخ!'' اس نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا ''تمہاری وہ بہن نہیں پہنچی جو لندن میں پڑھتی ہے اور جہاں تک مجھے یاد ہے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ فلیٹ شیئر کرتی ہے'' اس کا نگار کی خاطر جوابی حملہ سخت تھا۔ ماہ رخ نے نخوت سے سر جھٹکا۔

''تمہاری معلومات غلط ہیں ہومی، وہ میری بہن نہیں جس کا تم ذکر رہے ہو۔''

''میرا خیال ہے کہ میری یادداشت اتنی کمزور نہیں، تمہاری بہن کا نام ماہ بانو ہے نا۔ وہ ساؤتھ ایشین اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ میں مجھے ملی تھی، اس روز تم نے جو فوٹو گرافس اس کی دکھائی تھیں، میں درست پہچانا تھا'' ماہ رخ نے ایک مرتبہ پھر سر جھٹکا اور مزید وضاحت کرنا چاہی۔

''ہمایوں بھائی، پلیز اب میں گھر چلوں، امی بے چاری پریشان ہو رہی ہوں گی۔'' نگار نے درمیان میں کہا اور کھڑی ہوئی۔

''ہاں، چلو کافی دیر ہو گئی۔'' ہمایوں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''تمہارے گھر میں جگہ جگہ جو گھڑیال لگے ہیں، ان کی آواز باہر نہیں آتی، غالباً ساؤنڈ پروف دیواروں کی وجہ سے، ہے نا'' اس نے ماہ رخ پر ایک اور چوٹ کی۔ اس وقت اسے اس پر شدید غصہ آیا تھا، اس کا دل چاہ رہا تھا، اسے کھری کھری سناتا ہی چلا جائے۔

''آپ کو رکنا ہو تو رکیں، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔ فاصلہ ہی کتنا ہے'' نگار نے کہا۔

''نہیں، میں تمہیں خود ڈراپ کروں گا'' وہ قطعیت سے بولا اور اس کے ساتھ چلتا گیٹ سے باہر نکل آیا۔ اس مختصر سے راستے میں ان کے درمیان خاموشی رہی مگر نگار کے ذہن پر چھائی ساری کیفیات سے بلند ایک آواز تھی جو کانوں سے بار بار ٹکراتی تھی ''ہومی!''

☆

اس روز اسے سکول سے آتے آتے خاصی دیر ہو گئی۔ ٹرمینل امتحانات کے رزلٹ میں اسے اپنی مارکس شیٹس بنانا تھیں اور ایسے دن بہت مصروف ہوتے تھے۔ ''ایک سال میں اس گھر کی شکل کتنی بدل گئی۔'' اس نے پیدل چلتے چلتے دور سے اپنے گھر کو دیکھتے ہوئے سوچا ''جب میں پہلے دن ہمایوں بھائی کو گھر لائی تھی تو سوچ سکتی تھی کہ کبھی وہ اس گھر کی حیثیت تبدیل کر دیں گے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ سارے اختلاف کے باوجود

اب یہ گھر اچھا لگتا ہے۔ خصوصاً جب سے ہمایوں بھائی نے چیک لے لیا امی سے۔'' اسی قسم کی باتیں سوچتی، وہ گھر میں داخل ہوئی تو امی کو باہر لان میں دھری کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھے دیکھ کر حیران ہوگئی۔ وہ بہت کم کمرے سے باہر نکلتی تھیں۔ اس کے بہت اصرار پر بھی نہیں اور آج تو انہوں نے اپنا سفید چکن کا سوٹ پہنا اور کلف زدہ دوپٹہ بھی اوڑھ رکھا تھا۔

''خیریت، مدر ڈیئر! آج یہ انہونی کیسی؟'' اس نے آگے بڑھ کر ان کے گلے میں بازو ڈال کر پوچھا، اسے یہ منظر بہت ہی اچھا لگا تھا'' جب سے ہمایوں بھائی نے کیبل لگوا دیا ہے، آپ شاید ڈرامے دیکھ دیکھ کر متاثر ہونے لگی ہیں، ایسے منظر وہاں بھی نظر آتے ہیں۔''

''اچھا زیادہ باتیں مت کرو۔ وقت کم ہے، جانا ہے۔'' انہوں نے کہا۔

''ہائیں، جانا ہے؟'' وہ ایک دم پیچھے ہٹی ''کہاں جانا ہے، یہ میرے کان کیا سن رہے ہیں'' وہ کہیں بھی نہیں جاتی تھیں سوائے نزدیکی مارکیٹ سے سودا سلف لانے کے، وہ بھی اکثر وہ خود ہی لے آتی تھی۔ کبھی کبھی انہیں خیال اٹھتا کہ اس کی لائی ہوئی چیزیں معیاری نہیں ہوتیں تو وہ جوش میں نکل جاتی تھیں ورنہ تو باہر نکلنا انہیں سوہانِ روح لگتا تھا۔

''مجدی خالہ کی طرف جانا ہے کیا'' ایک وہ ہی امی کی سہیلی تھیں جو خود کبھی کبھار آجاتیں اور برسوں سے اصرار کر رہی تھیں کہ وہ بھی ان کی طرف آئیں مگر امی کے بقول ہمت ہی نہ تھی۔ اسے خیال آیا شاید آج ان کی بات مان لینے کو دل چاہا ہے۔

''تم قیافے لگاتی رہنا، کھڑے کھڑے۔ چلو اپنی چیزیں اندر رکھو، بال سلجھاؤ، منہ ہاتھ دھو لو۔ دودھ کا گلاس فریج میں رکھا ہے، پی لو اور چلو، ہمایوں کا فون آیا تھا۔ بچہ بیمار ہے کئی روز سے۔ اس نے تو نہیں کہا، میں نے خود سوچا کہ اس کی خیریت معلوم کرنے جانا چاہیے۔ لاکھ سہولتیں میسر ہوں، اپنوں کی اپنائیت کی بات ہی اور ہوتی ہے۔''

''نگار نے اندر آتے ہوئے سوچا، کیسی ممتا اتر رہی ہے ان کو۔ چاہے وہ انہیں دیکھ کر بیزار ہی ہو جائیں'' منہ ہاتھ دھوتے دھوتے اسے، کئی قسم کے خیال آئے مگر امی کی خوشی کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی تھی سو چلنے کے لیے تیار ہوگئی۔ امی نے احتیاطاً ہمایوں سے اس کا ایڈریس کئی روز پہلے لے لیا تھا سو پہنچنے میں دقت نہیں ہوئی۔ وہ لبرٹی میں لگژری اپارٹمنٹس کمپلیکس کے ایک اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔

''شکر ہے لفٹ موجود ہے ورنہ آ کر بھی نیچے سے ہی واپس جانا پڑتا۔ ہماری ٹانگوں میں اتنا دم کہاں۔'' امی جو عرصہ بعد گھر سے باہر نکلی تھیں وہ راستہ بھر مختلف چیزوں پر تبصرے کرتی رہی تھیں، لفٹ پر سوار ہوتے ہی بولیں

''اب ا[illegible] میں رہو کر دل تو نہیں گھبرا رہا۔'' نگار نے مذاقاً کہا۔

''خیر، آج کا زمانہ اور ہے۔ لوگ جھولے لینے لگے، ایسی چیزوں پر ہر خاص و عام کی رسائی ہوگئی۔ میں تو برس گزرے تمہارے ابا کے ساتھ یورپ اور افریقہ کے ملکوں میں خوار ہوتی رہی مگر ایسی چیزوں سے آشنائی جب ہی ہوگئی تھی'' وہ اپنی روایتی سادگی سے بولیں۔ ہمایوں بیل بجنے پر خود دروازہ کھولنے آیا تھا اور انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

''ارر ..... رے!'' وہ تقریباً چیخا ''بہت بڑا سرپرائز ہے یہ چچی جان بہت بڑا سرپرائز!'' وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے سے ہی لگ رہا تھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے نائٹ سوٹ پہن رکھا تھا اور ہائی نیک سوئیٹر، اسے جاتی سردی نے قابو میں لے لیا تھا۔

''اپنی فیملی کے ہاتھوں چوبرجی کے ایک تنور سے قیمے والے نان اور چٹنی کھا بیٹھا تھا۔ فلو، گلا خراب اور پیٹ بھی خراب'' اس نے انہیں لاؤنج میں بٹھاتے ہوئے کہا ''مگر کیا قسمت والی بیماری ہے، جو آپ کو گھر سے باہر کھینچ لائی'' وہ بہت خوش تھا یا نہیں بہرحال نظر آنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا۔

''بتایئے کیا پئیں گی، کیا کھائیں گی؟'' وہ چچی جان کے قریب بیٹھ کر پوچھ رہا تھا۔

''لو میاں!'' وہ عینک درست کرتے ہوئے بولیں ''ہم آئے تمہاری خیریت دریافت کرنے، تم ہماری مہمانداری کا سامان کر رہے ہو، بیٹھے رہو آرام سے'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی ٹوکری اس کے حوالے کی ''یہ میں چند چیزیں بنا لائی تمہارے لیے۔ ٹھیک سے معلوم تو نہیں تھا کہ تمہیں بیماری کیا لاحق ہوئی؟ میں نے کہا سردی کا اثر ہوگا؟ انڈوں کا حلوا اور گاجر کا حلوا بنایا تھا۔ سوپ بھی ہے تھرماس میں، اب تم پیٹ کی خرابی سنا رہے ہو، کچن ہے تمہارے یہاں، کوئی چاول وغیرہ بھی ہیں کہ نہیں لاؤ میں کھچڑی بنا دوں۔''

''اوہ میرے خدا چچی جان! آپ تو مجھے بالکل میری امی کی یاد دلائے دے رہی ہیں'' اس نے سر پر ہاتھ مارا ''مجھے تو ان لاڈوں اور چونچلوں کی عادت ہی نہیں رہی۔''

''اماں ہوتیں تمہاری زندہ تو کیا تم اس طرح چھڑے چھانٹ گھوم رہے ہوتے اب تک، کھونٹے سے باندھ چکی ہوتیں پھر تمہارے چونچلے اور لاڈ کسی اور کی ذمہ داری ہوتے'' انہوں نے ہنس کر کہا۔

''اپنی سی کوشش کر چکی تھیں وہ اپنی زندگی میں مگر نا کام رہیں'' وہ مسکرا کر بولا۔

''افسوس کی بات ہے'' چچی جان نے سر ہلایا اور پھر ذرا سیدھی ہوتے ہوئے کمرے کا جائزہ لینے لگیں۔

''تمہیں کیسے توفیق ہوئی مس آدم بیزار! چچی جان سے تو شاید میں پھر بھی توقع کر سکتا تھا، تمہارا آنا تو بالکل ہی خلاف توقع ہے'' وہ خاموش بیٹھی نگار سے مخاطب ہوا۔ اس نے ذرا سا ہل کر اپنی پوزیشن بدلی۔

''چچی جان اکیلے آنہیں سکتی تھیں شاید تم ان کے خیال سے آ گئیں؟'' پھر اس نے خود ہی خیال ظاہر کیا ''بہرحال جیسے بھی ہوئی آپ کی آمد سر آنکھوں پر، فرمایئے کیا خدمت کروں؟'' چچی جان کو اس کی کھچڑی کی فکر پڑی تھی۔ وہ انہیں کچن دکھانے لے گیا۔ اب نگار نے خود کو ذرا آرام میں محسوس کیا اور کمرے

کا جائزہ لیا۔ اس گھر کو ویسا ہی ہونا چاہیے تھا جیسا اس کے تصور میں تھا۔ قیمتی فرنیچر، قیمتی قالین اور قیمتی نوادرات سے سجا کمرہ۔ ایک طرف رکھے بک شیلف کے قریب جا کر اس نے کتابوں کے ٹائٹل دیکھے۔ انگریزی اور اردو ادب، تاریخ، تنقید، معاشیات، فلسفہ، نہ جانے کون کون سے موضوعات پر قیمتی کتابوں سے بھری پڑی تھی وہ بک شیلف۔ ٹی وی کے قریب رکھے سی ڈی ریک میں موجود سی ڈیز بھی اس کے ذوق کا پتہ دے رہی تھیں۔ اسے اپنے دل میں ایک عجیب سی خوشی اترتی محسوس ہوئی ''تم واقعی منفرد ہو'' پھر اس کی نظر ٹی وی کے اوپر دھرے تازہ پھولوں کے مہکتے بوکے پر پڑی، اس نے اس کے ساتھ جڑا چھوٹا سا کارڈ کھولا "Get well Soon" کارڈ پر الفاظ برجستہ تھے اور نیچے قلم سے ماہ رخ کے سائن تھے۔ کچھ دیر پہلے اتری خوشی دل کے ساتھ ہی ڈوب گئی۔ ''مگر رسائی سے باہر ہو'' اس نے دل ہی میں اپنی پچھلی بات کو مکمل کیا اور واپس اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گئی۔ بیٹھتے بیٹھتے اس کی نظر کچن کے دروازے میں کھڑے ہمایوں پر پڑی۔ وہ اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گڑبڑا گئی۔

''امی، کہاں رہ گئیں؟'' بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

''وہ کچن میں مصروف ہو گئیں، باوجود میرے بہت منع کرنے کے۔ یہ ان کی ممتا کا کمال ہے، ماں ہیں نا، ورنہ کسی اور کو ایسا خیال کیسے آ سکتا ہے'' نگار نے سر جھکا کر کلائی کی گھڑی کا اسٹریپ ٹھیک کیا۔

''ماہ رخ بھی آپ کی خیریت پوچھنے آئی تھی۔'' بے اختیار اس کے منہ سے ایک ایسی بات نکلی جو وہ ہرگز نہیں پوچھنا چاہتی تھی۔

''ماہ رخ!'' اس نے دُہرایا ''ہاں، خیریت معلوم کرنے آئی تھی، تم نے یہ بوکے تو دیکھا ہی ہوگا، ساتھ میں وہ یہ کتابوں اور سی ڈیز کا بنڈل بھی لائی تھی۔'' اس نے ایک بند پیکٹ اٹھایا اور اس کا ٹیپ کھولنے لگا۔

''ایک روز میں نے یونہی کہہ دیا، مجھے صدیق سالک اور امرتا پریتم کی ایک دو کتابیں نہیں مل رہیں، نہ جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر یہ لے آئی اور بیگم اختر کی سی ڈی غالب کی غزلوں والی، دیکھو وہ بھی ہے۔''

''اے یہ کون اتنا باذوق ہے، جو غالب کی غزلیں اور صدیق سالک کی کتابیں لاتا ہے'' چی جان کچن سے نکلتے ہوئے بولیں۔ انہوں نے آدھی بات سنی تھی۔

''ماہ رخ چی جان!'' ہمایوں نے سی ڈیز کو الٹتے پلٹتے جواب دیا ''کہہ رہی تھی، بیماری اور چھٹی میں وقت گزاری کا اچھا ذریعہ ہیں یہ دونوں چیزیں۔''

''اے میاں! یہ تو گوڈر سے گندوڑا نکلنے (جاہلوں کے گھر عالم پیدا ہوتا) والی بات ہے۔ ماہ رخ کی تو سات پشتوں میں کوئی اتنا ادب پرست باذوق نہیں تھا'' چی جان نے منہ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

''گوڈر سے گندوڑا نکلنا'' ہمایوں کی ہنسی چھوٹ گئی اور ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا ''چی جان! آپ کی یہ ہی گفتگو آپ کی شخصیت کا حسن ہے۔ آپ جیسے لوگ اب نایاب ہو رہے ہیں۔''

''اے میاں! اب زبان کی سی کہوں یا تلوار کی سی کہوں؟'' وہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولیں ''نایاب کیا ہونا ہے لوگوں نے، وقت کی چال دیکھ کر عزت سنبھال گھروں میں دبک گئے ہیں۔ ہم جیسوں کا زمانہ کہاں ہے اب، ہمیں تو لوگ احمق بے وقوف سمجھتے ہیں، بہت سنی ہیں زمانے کی، انگلیوں پر گننے بیٹھوں تو گنا نہیں جاتا۔ خیر جو رہ گئی ہے وہ بھی گزر ہی جائے گی۔ نگار، میں نے چائے کا پانی رکھا ہے، جاؤ اب تم چائے بنالو۔'' وہ نگار سے بولیں۔

''بہر حال چچی جان! میرے کلیکشن میں صرف ان چند کتابوں کی کمی رہ گئی تھی، دو کی یوں پوری ہوئی، ایک دو جو رہ گئیں وہ مل جائیں تو سامان بندھواؤں؟'' اس کے جانے کے بعد ہمایوں نے کہا۔

''سامان بندھواؤں؟'' وہ چونکیں ''وہ کیوں، کیا اس فلیٹ سے کہیں اور جانے کا ارادہ ہے؟''

''واپسی کا ارادہ ہے، میں واپس فرانس جاؤں گا'' اس نے ہونٹ بھینچ کر کھولتے ہوئے کہا۔

''مگر کیوں بھیا! اتنی اچھی شاندار زندگی یہاں بھی ہے تمہاری۔'' وہ بری طرح گھبرائیں ''کیا کوئی نوکری کا معاملہ ہے؟''

''یونہی سمجھ لیں۔ مجھے وہاں بلایا جارہا ہے نوکری کا معاملہ ہے جانا ہی پڑے گا۔''

چچی جان نے سیدھے ہو کر گہرا سانس لیا ''لو چار دن کی رونق لگا کر یہ بھی غائب۔ اب جو دل کو اس کی عادت پڑ گئی ہے، اس کا کیا بنے گا؟ نہ جانے کیوں آیا یہ ہماری زندگیوں میں تہلکہ مچانے'' بیٹی کی ہر کیفیت سے بھی وہ آگاہ تھیں مگر بے بس تھیں ''زحل کا عمل ایسا ٹھہرا اس کی زندگی میں، جانے کا نام نہیں لیتا۔ ایک وہ ماہ رخ ہیں، جانے کہاں سے بیچ میں آئیں اور جھپٹا مار لے گئیں، سچ کہتی ہے نگار، مایا کو مایا ملتی ہے۔ اب میاں، تم ہمیں نایاب کہو یا دستیاب کہو، ہم تمہارا معیار تو ہرگز نہیں ہو سکتے۔'' اندر کچن میں کھڑی نگار کچن کا جائزہ لینے کے بعد ٹرے میں پیالیاں رکھتے ہوئے کچھ ایسی ہی بات سوچ رہی تھی۔ دل کو خواہش کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ میں نے اتنے سال کوشش کر کے دیکھ لی نا، زندگی میں آنے والے اس ریلے نے سارے بند خس و خاشاک کی طرح بہا دیئے۔ مگر دل کیا جانے، اس کا مقسوم تو تنہا رہنا ہے۔ خواہش کے، بغیر کسی رنگ کے، اب اس کو سمجھانے میں کتنا وقت لگے گا، کون جانے؟

''یہاں آنے سے ایک فرق پڑا'' اندر کمرے کی خاموشی توڑتے ہوئے ہمایوں نے چچی جان کو ان کے خیالات سے جگایا ''میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے'' چچی جان نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ان کے سامنے صوفے پر آڑا ترچھا لیٹا ہوا تھا۔

''کیوں بھیا! ماہ رخ اور اس کے گھرانے میں اتنی کشش ہے، وہ پاکستانی بھی ہیں، اونچے معیار و اثر و رسوخ والے بھی۔ ان کو یہ سارے چونچلے بھی آتے ہیں'' انہوں نے ایک نظر ہمایوں کے ساتھ والی میز پر رکھے پیکٹ پر ڈالی۔

''پتہ ہے کیا چی جان!'' وہ اٹھ کر ان کے قریب آیا اور ان کے قدموں میں بیٹھ گیا ''میں یہاں محض اس معاشرے میں اس فضا میں ایک بار پھر سانس لینے آیا تھا اور اس خوشبو اور کھوئے ہوئے اس رنگ کو ڈھونڈنے جواب کہیں نہیں ملتا، جس کی تلاش میں، میں نے ساری دنیا گھوم ڈالی مگر یقین جانیے، وہ مجھے یہاں بھی نہیں ملا۔ یہاں آکر میں نے یہاں کی زندگی کا ہر پہلو، ہر رنگ دیکھا ہے۔ طبقۂ امراء میں، میں نے ان کی تقریبات، ماحول، ترجیحات دیکھی ہیں۔ وہ اس سے چنداں مختلف نہیں جو میں چھوڑ کر آیا تھا۔ متوسط طبقہ، طبقۂ سفید پوش۔ گلے ہوئے ہیں زندگی کی گاڑی کھینچنے اور طبقۂ اول کی تقلید میں منہ لال کرنے، اس کوشش میں پہلے لوگوں کی طرح سفید پوشی کا بھرم بھی نہیں رکھتے اکثر اوقات، اور طبقۂ سوئم جو جیسا پہلے تھا، اب تک ویسا ہی ہے۔ مگر اصول، ضابطے، اخلاقیات سے یہ بھی عاری ہو چکا ہے۔ اس ملک میں جرائم کی شرح اسی لیے تو بڑھ گئی ہے کہ اس قوم کو لالچ اور حرص کے شیطان نے اپنی گرفت میں لے لیا ہے اور اپنی خواہشات کو پانے کے لیے وہ کسی گناہ ثواب کے چکر میں نہیں پڑتے۔ معاشرے کے تمام لوگوں کا کم و بیش یہی حال ہے۔ میں، یقین جانیے بہت مایوس ہوا ہوں اس حالت سے۔ اوپر سے وہ لوگ ہیں جو میڈیا کے سارے موڈز پر آکر تاریخ سناتے ہیں، مذہب کی باتیں کرتے ہیں، ثقافت کی بات کرتے ہیں۔ میں ان سب سے بھی ملا، ان کی نجی زندگیاں دوعملی کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی بیٹیاں شرمناک لباس پہن کر تقریبات میں شریک ہوتی اور ناچتی ہیں۔ ڈرنک کرنا ان کے ہاں کا معمول ہے۔ اس کے سلسلے میں یہ لوگ نئے نئے فتوے سنانے لگے ہیں۔ اتنا پینے سے گناہ ہوتا ہے، اتنے سے نہیں ہوتا۔ لاحول ولاقوۃ'' اس نے سر ہلایا ''میں یہ توقع ہرگز نہیں کر رہا تھا۔ پھر کچھ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ ماڈرن دنیا کی ترقی کا کچھ مزہ چکھنے کا حق تو ہونا چاہیے نا ہمیں بھی۔''

اس نے دم بخود کھڑی نگار پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''مگر ماڈرن دنیا تو ہر جگہ نظر آتی ہے، ہم میں اور ان میں فرق کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہم بھی تو انہی جیسے ہو چکے ہیں۔ ہمارا تمدن، اخلاق، ثقافت کہاں ہے، باتوں کی حد تک۔ میں نے یہاں جو ثقافتی شو دیکھے، ان کو دیکھنے کے دوران میں مجھے وہ تاریخ یاد آتی رہی جو اس ثقافت کی ہے، جسے یہ لوگ لیبل کرتے ہیں۔ آئی ایم رئیلی سوری!'' اس نے سر جھکایا ''مجھے کوئی بھی وہ نظر نہیں آیا جس کی تلاش میں، میں یہاں آیا تھا۔''

کچھ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ جو اس نے خود ہی توڑی۔

''میرے ذہن میں کچھ اور خاکہ تھا۔ ایک ایسا گھر جو پکار پکار کر کہے کہ میرے مکین اس ثقافت اور تاریخ کے امین ہیں جو بہت اچھوتی، بہت منفرد ہے۔ مجھے اس سارے میں وہ مانوس خوشبو اور وہ مانوس رنگ صرف ایک جگہ نظر آیا'' چی جان کا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا، اب وہ دھماکہ ہوا کہ ہوا۔

''ایک گھر جہاں کے مکین اتنی زرخیز ثقافت کے امین ہیں کہ فیشن کی تقلید کے مارے لوگ سن لیں تو

انہیں سر آنکھوں پر بٹھائیں مگر وہ اتنے سادہ، اتنے بے ریا اور بے نیاز ہیں کہ خزانے اپنے سٹور روم میں مقفل کیے اپنے حال میں مست درویشانہ زندگیاں بسر کیے جا رہے ہیں، جو اپنے مخاطب کی ڈھینگوں اور شیخیوں کے جواب میں ایک بار بھی یہ نہیں کہتے کہ جھوٹ مت بولو۔ جو اپنے پر پڑے کو انتہائی سادگی بلکہ سادہ لوحی سے مان لیتے ہیں کہ ہاں، یہ ہمارے ساتھ ہوا۔ اور دنیا کو دعوت دیتے ہیں کہ انگلیاں اٹھا اٹھا کر کہے کہ وہ غلط ہیں، قابلِ نفرین ہیں۔ چی جان، یقین جانیے، مجھے توقع نہیں تھی، یہاں آنے کے فوری بعد کے حالات دیکھ کر میرا خیال نہیں تھا کہ مجھے ایسے لوگ ایسا ماحول بھی کہیں ملے گا۔ مگر اتفاق سے مجھے نگار مل گئی اور اپنے گھر بھی لے گئی۔ بہت اچھا ہوا، بہت ہی اچھا ہوا اور نہ شاید یہ حسرت دل میں رہ جاتی کہ ملک ملک گھوم کر اپنے ملک گیا تو بھی مایوس لوٹا'' اس نے نگار کی لائی ٹرے میں سے چائے کا کپ چی جان کے سامنے رکھا اور خود اٹھ کر کچن کی طرف چلا گیا۔ نگار نے ایک نظر ماں کے چہرے پر ڈالی۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھیں۔ ان کا سر بار بار نفی میں ہل رہا تھا۔

''بہت ست الوجود ہو بھئی! میں اوون میں چند چیزیں رکھ آیا تھا۔ وہ بھی نکال کر نہیں لائیں'' کچھ دیر بعد وہ ایک اور ٹرے اٹھائے ادھر آیا۔

''لیں چی جان! یہ نگٹس اور جنجر اسنیپس ماہ رخ لائی تھی میرے لیے۔ کل سے فریزر ہی میں پڑے ہیں۔ آپ بھی چکھیے'' اس نے ایک پلیٹ اور سرونگ ڈش چی جان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! ماہ رخ تو اچھی لڑکی ہے۔ پڑھی لکھی اور سمجھدار۔ اس کا گھرانا بھی اب ایسا گیا گزرا نہیں رہا۔ تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے'' چی جان نے چائے کی پیالی میز پر دھرتے ہوئے کہا۔ نگار کا دل مایوسی کی لہر میں بہنے لگا۔

''ماہ رخ سے.....؟'' وہ ہنسا ''ارے چی جان! آپ نے ابھی گوڑ سے گندوڑا نکلنے کی بات کی تھی نا، تو یہ کوئی گندوڑا ونڈور انہیں ہے، گوڑ ہی گوڑ ہے۔ ماہ رخ شروع میں مجھے واقعی اچھی لگی تھی اور وہ ہے اتنی سمجھدار، میرا مزاج سمجھتے ہی اس نے اپنا چولا بدل ڈالا۔ وہ ایک دم باذوق اور ادب پرست بھی ہو گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والے بھی مگر سطحی چیزیں سطحی ہی رہتی ہیں، جڑ نہیں پکڑ سکتیں زمین کے اندر۔ ویسے میرا سنجیدگی سے یہ خیال ہے کہ ماہ رخ اور اس کی فیملی کو جھوٹ اور مبالغہ پرستی پر ملک کا کوئی بڑا ایوارڈ ضرور دلوانا چاہیے، وہ حق دار ہیں اس کے۔ آپ کو معلوم ہے ماہ رخ کی بہن ماہ بانو وہاں چیلسی میں رہتی ہے، اپنے ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ۔''

''بے نکاحی! یا بیاہ کر لیا؟'' بے اختیار چی جان کے منہ سے نکلا۔

''پہلے والی بات درست ہے اور وہ لوگ اس کو بھی اب ایک طرح سے باعزت طریقے سے بیان کریں گے کہ ماہ بانو نے لڑکا یعنی ایک عیسائی کو مسلمان کیا اور پھر اس سے شادی کر لی۔ کون مانے گا کہ بے نکاحی

رہ رہی ہے۔ پھر اس سے بھی ان کو سوسائٹی سے واہ واہ ملے گی۔ آپ کی طرح تھوڑی ہیں لوگ، بیٹیاں غیر مسلمانوں کے ساتھ شادیاں کر رہی تھیں، آپ لوگوں سے زیادہ چیختے رہے، اور سر جھکا کر ناکردہ جرم کا اعتراف کیا" ہاں جی ہماری تربیت میں ہی کمی تھی، تربیت میں کمی تھی تو یہ لڑکی کیوں بے لگام نہیں ہوئی، الٹا اس بے چاری نے راہبانیت کا راستہ اختیار کر لیا۔ یہ صرف آپ کی وجہ سے ہوا۔ آپ کو یوں بھرم جتانے آتے ہوتے تو بہرحال نگار بہت بہتر زندگی بھی گزار سکتی تھی۔"

"ہم سادہ لوگ تھے۔ ریا، مذہب، دھوکہ، جھوٹ، ہمیں ان سب چیزوں کا علم ہی نہیں تھا۔ نگین اور ماہین نے جب یوں شادیاں کیں تو لوگ تو کہیں رہے ہم خود دم بخود تھے، ہماری نسلوں کی اخلاقیات اور شرافت کے جنازے نکل رہے تھے، ردعمل لازمی تھے۔ اپنی گندی لینن پر اطلس وکم خواب کے پردے کیسے ڈالتے ہیں ہمیں یہ نہیں معلوم تھا بلکہ ہماری تربیت میں تو غلط کو غلط کہنے کا عمل دخل تھا، بیٹا یہ مکروفریب تو ہمیں اب بھی نہیں آئیں گے، جب ہی تو کہتے ہیں ہمارے جیسے لوگوں کو اٹھ جانا چاہیے۔" چچی جان شدید دکھ کے احساس کے ساتھ بولیں۔

"نہیں چچی جان! آپ جیسے لوگ ہی تو ہمارے جیسے مایوس لوگوں کی اندھیاری دنیا کا نارتھ اسٹار ہیں۔ میں نے آپ سا قناعت پسند، راضی بہ رضا بندہ کہیں اور نہیں دیکھا، مگر مایوسی بہرحال غلط ہے جس میں آپ خود بھی ڈوبی ہوئی ہیں اور اپنے ساتھ ساتھ اس لڑکی کو بھی ڈبوئے بیٹھی ہیں۔" اس نے نگار کی طرف دیکھا۔ نگار کو محسوس ہوا وہ کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ وہ کہنا چاہتی تھی "تم کون ہوتے ہو ہم پر اتنے بے لاگ تبصرے کرنے والے، رہنے دو ہمیں ہمارے حال میں زندہ، تم اپنی زندگی گزارو۔" مگر اس کی زبان جیسے، بالکل خشک تھی۔ کسی چیز کو پانے کی امید سے اس کے ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے چلے جانے کے دکھ کی کیفیت نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔

"شام گہری ہو رہی ہے، اب ہم چلتے ہیں، میں ذرا کھچڑی دیکھ لوں پھر...... نگار چلنے کی سوچو اب۔" چچی جان نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ان کے پاس ہمایوں کی کسی بات کا جواب نہیں تھا شاید۔

"تمہیں برا لگا نا۔ میں زیادہ ہی کڑوا بول گیا۔" ان کے جانے کے بعد ہمایوں نے نگار کی طرف دیکھا "مجھے افسوس ہے شاید میں ہمیشہ ہی تمہارا دل دکھا دیتا ہوں، اگرچہ میں تمہارا بے حد مشکور ہوں، اگر تم مجھے نہ ملتیں تو میں چچی جان سے اور اس ختم ہوتی تاریخ سے کہاں مل پاتا۔"

"کوئی انسان یا تو اچھا ہوتا ہے یا برا، میری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آ رہی، ایک ہی سانس میں آپ امی کی تعریف کر رہے ہیں اور اسی سانس میں انہیں لتاڑ رہے ہیں۔" نگار کے لہجے سے خفگی عیاں تھی۔

"میں خدانخواستہ انہیں برا تو ہرگز نہیں کہہ رہا، ہاں بزرگ بھی اگر کوئی غلطی کر رہے ہیں تو اس غلطی کی نشاندہی کرنا کچھ اتنا بھی غلط نہیں۔" ہمایوں نے موبائل کی بجتی بیل پر اسے میز سے اٹھا کر آنکھوں کے

سامنے کرتے ہوئے کہا ''تمہاری دوست کا فون ہے، ماہ رخ خاتون کا، بات کرو گی۔'' پھر اس نے مسکرا کر کہا۔ نگار جز بز ہوگئی ''تمہاری دوست ہے اور تم اس کے ذکر پر اتنی ناراض نظر آتی ہو کہ کیا بتاؤں، ادھر وہ بھی تمہارے ذکر پر نالاں ہو جاتی ہے۔ بڑی دلچسپ صورتحال ہے اس کی وجہ کیا ہے؟'' ''تم'' نگار کے دل نے کہا مگر زبان خاموش رہی۔

''کھچڑی تیار ہے بیٹا، برتن میں نے دھو کر رکھ دیے، اب چلو نگار دیر ہو رہی ہے۔'' چی جان نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

''بس صرف اتنی دیر ٹھہرنا تھا آپ کو۔'' وہ سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

''تمہیں دیکھنا مقصود تھا، اب دیکھ لیا تو چلیں، ایک تو یہ کم بخت ٹیکسی والے بھی سونخرے دکھاتے ہیں۔''

''آپ بیٹھیں، میں دومنٹ میں چینج کر کے آتا ہوں، آپ کو خود چھوڑ آؤں گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

''نہیں یہ زحمت مت کرو، تمہاری طبیعت خراب ہے، ہم چلے جائیں گے۔'' انہوں نے منع کیا۔

''یہ بات کہنے کی ضرورت ہی نہیں آپ کو، میں پہلے سے سوچے بیٹھا تھا کہ آپ کو واپس میں چھوڑ کر آؤں گا۔'' اس نے اپنے بیڈروم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

''آپ کو کہیں ڈنر کرواؤں چی جان۔'' واپسی کے سفر میں اس نے اچانک انہیں مخاطب کیا جو اب تک گہری سوچ میں ڈوبی تھیں۔

''نا بھیا، مجھے تو معاف ہی رکھو۔'' انہوں نے صاف انکار کیا۔

''الوداعی ڈنر سمجھ لیجئے گا اس کو، دیکھئے انکار مت کیجئے گا۔'' اس نے ویلج کے سامنے گاڑی روکی۔

''آیئے۔'' دروازہ کھول کر وہ انہیں باہر آنے کو کہہ رہا تھا۔

''اے بیٹا، میں بوڑھی ٹھٹھول اچھی لگ رہی ہوں کیا۔'' وہ اندر داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

''لیں...... آپ بوڑھی ہیں، ذرا ارد گرد نظر ڈالیے آپ کو اپنے بزرگوں کی عمر کے لوگ بھی نظر آئیں گے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔ نگار اس صورتحال پر سخت برافروختہ تھی۔ اسے لگ رہا تھا وہ جی بھر کر انہیں ذلیل کرنے پر تلا تھا مگر وہ حسب معمول خاموش تھی۔ اس کی ناراضی البتہ اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

''آپ تو گاؤں کے ماحول سے نا آشنا ہی ہوں گی چی جان، یہ دیکھیے ان لوگوں نے گاؤں کا کیسا ماحول سجایا ہے۔'' وہ ان کے لیے پلیٹ میں کھانا لاتے ہوئے بولا ''محترمہ آپ خود ہی زحمت کرلیں اور کھانا لے آئیں کب تک غصہ کھائیں گی۔'' پھر اس نے نگار کو مخاطب کیا۔ وہ بغیر کچھ کہے اٹھ گئی۔

''ہمایوں بچے، یوں اکیلے زندگی نہیں گزرتی، یہ شادی نہ کرنے کا فیصلہ غلط ہے اسے بدل ڈالو۔'' چی جان کی سوئی شاید اسی ایک نقطے پر اٹکی تھی۔

''آپ نگار سے بھی کہیں شادی کرلے۔'' وہ کانٹے سے کباب توڑتے ہوئے بولا۔

''اس سے کہنا کیا، کوئی برا آئے تو کہوں، پوچھوں گی تو ہرگز نہیں بس بیاہ کرنے کی کروں گی۔''

''سچ بتائیے آپ کا دل کتنا مطمئن رہتا ہے۔ یہ سوچ کر کہ اس بیٹی نے مجرد رہ کر آپ کی تربیت کی لاج رکھ لی۔''

''ذرا سا بھی نہیں، جتنی بے چین میں اس کی طرف سے رہتی ہوں شاید کسی اور بات پر نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا ہے اسے کہوں جاؤ تم بھی کوئی اپنے لیے ڈھونڈ لو، میرے دم کا کیا بھروسہ ہے۔''

''اب تک کہا کیوں نہیں؟'' انہوں نے ایک نظر اٹھا کر اسے دیکھا جو بڑے انہماک سے کھانا کھانے میں مصروف تھا۔

''اب کہہ دوں گی، کیونکہ میری سمجھ میں آ گیا ہے کہ لوگ پرانے ریتوں روایتوں کی پاسداری کرنے والوں کو دور دور سے شاباشی تو دے سکتے ہیں، ان کے مسائل حل کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔'' ان کے لہجے میں بلا کا غصہ تھا اور چبھن بھی۔ وہ ایک دم چمچ پلیٹ میں رکھ کر زور سے ہنسا۔

''چچی جان یہ آپ نے خوبصورت بات کی۔''

''شاباش میاں شاباش، تم بھی اندر سے وہی نکلے تماش بین، چسکا لینے والے۔'' وہ دل ہی دل میں جھنجھلائیں۔ پھر نگار کو آتے دیکھ کر مصلحتاً خاموش رہیں۔

''بہت دیر لگا دی تم نے کھانا چوز کرتے کرتے۔'' ہمایوں نے کہا ''سرسوں کا ساگ لیں گی آپ؟'' پھر چچی جان سے پوچھا

''نہیں رہنے دو، میں سیر ہو چکی، تم لوگ بھی جلد ختم کرو پھر چلیں۔''

''ارے، ڈیزرٹ تو لیں گی آپ، نگار تم چچی جان کے لیے ان کا کوئی پسندیدہ ڈیزرٹ تو لے آؤ۔'' انہیں لگا اس نے دانستہ نگار کو وہاں سے اٹھایا تھا ''اب اور دل جلاؤ میرا۔'' انہوں نے سوچا۔

''تمہارا تو پیٹ بھی ٹھیک نہیں ہے ہمایوں، یہ کھانا مسئلہ کرے گا تمہیں۔'' اور کچھ نہیں سوجھا تو وہ ایک نکتہ ایسا لے آئیں جس پر اسے ست سنا سکیں۔

''آپ کی تیمارداری کے صدقے ٹھیک ہو گیا میں، کھچڑی فریز کر لوں گا پھر کام آئے گی۔'' وہ بے پروائی سے بولا ''ویسے چچی جان! ایک بات بتاؤں ریتوں روایتوں کی پاسداری کی تعریف کرنے والے لوگوں میں حوصلہ نہ ہو تو کیا ضرورت ہے انہیں تعریف بھی کرنے کی، اور بھی تو دنیا بھری پڑی ہے ایسی باتوں کی پروا نہ کرنے والی۔ آپ کو معلوم ہے میں دوسری یا پھر تیسری ملاقات کے بعد ہی سوچنے لگا تھا کہ کیسا ہو گا وہ گھر جس میں آپ جیسی خاتون کی راہنمائی سے چلنے والا نظام ہو گا، کیسی ہو گی وہ نسل جس کو آپ وہ سب بتائیں گی جو ہماری ثقافت اور روایات کا خاصہ ہے، یہ زبان و بیان یہ محاورات، وہ تاریخ جس کی آپ امین ہوں، یقین جانیے مجھے اس گھر کی تصور ہی سے مزہ آنے لگا تھا، مگر میں نگار کے رویے اور آپ کے خاندانی پس منظر سے

ڈرتا رہا۔ وہ عمر میں مجھ سے کافی سال چھوٹی ہے، آپ کا گھرانا ہمارے گھرانے سے بہت مختلف اور بلند رہا تھا، ساتھ ساتھ آپ کا معیار بھی، آج ہم جو بھی بن چکے ہوں، آپ کا ذہنی معیار معلوم نہیں مجھے قبول کرے یا نہیں، پھر میں نے دانستہ طور پر تجزیئے کرنا شروع کر دیئے۔ آپ کا ماحول، یہاں کے دوسرے لوگوں کا ماحول، نگار کا مزاج، اس کی ہم عمر دوسری لڑکیوں کا مزاج، یقین جانئے ہر دوسری لڑکی نے خود سے خواہش ظاہر کی میرے ساتھ کی، وجہ یہ نہیں کہ میں کوئی بڑی خاص چیز ہوں بلکہ اس لیے کہ یہاں کے لوگوں نے ایک میعار بنا رکھا ہے، فارن سیٹلڈ لڑکا، فارن کوالیفائیڈ لڑکا، اچھی پوسٹ وغیرہ وغیرہ۔ مگر سلام آپ کی اور نگار کی وضع داری کو۔ آپ کی جھنجلاہٹ اور ماہ رخ سے میری دوستی پر نگار کے مزاج کی تبدیلی کہ میں نے محسوس کی مگر کتنے بڑے دل کے ساتھ آپ آج بھی مجھے ماہ رخ سے شادی کرنے کی تلقین کرتی رہیں، میں بلاشبہ بہت متاثر ہوا۔ مگر ابھی تک ڈرتا ہوں، میں آپ سے کہوں اور آپ انکار کر دیں میں عمر بھر پچھتاتا رہوں گا۔'' ہمایوں نے دیکھا چچی جان اور نگار دم بخود بیٹھی تھیں۔

''ہم خود کو کسی قابل نہیں سمجھتے رہے اور یہ جواب ہماری زندگیوں میں رچا بسا ہے اور جس کے جانے کے خیال سے دل کو کچھ ہونے لگا، یہ خود کو ہمارے قابل سمجھتے ہوئے ڈرتا ہے۔ یا اللہ وہ وقت بھی تھا جب واقعی ہمارے گھرانے کی طرف دیکھتے ہوئے لوگ ڈرتے تھے، کیا واقعی یہ سچ کہہ رہا ہے یا صبح سے جو نت نئی سنا رہا ہے یہ اسی کا تسلسل ہے۔''

''نگار..... میں نے چچی جان سے کہا ہے کہ تمہیں اس خود ساختہ پابندی سے آزاد کر دیں جس میں مقید تم نے زندگی کی ساری خوشیاں خود پر حرام کر رکھی ہیں، زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، دوسروں کی کرنیاں بھگتنے میں اسے ضائع کر دینا بہت بڑی ناانصافی ہے۔''

''جو کچھ ہم نے سنا اور سہا، وہ شاید بتانے میں کچھ اور مگر حقیقی کیفیت سے گزرنا کچھ اور تھا، ہمایوں بھائی ہمارے سارے رویئے، ہم پر گزری کیفیتوں کے ردعمل ہوتے ہیں، ہم پر بھی جو کچھ بیتا، اس کے ردعمل کے طور پر میرا مزاج، میرا رویہ، میری کم آمیزی، میرا دوبٹیانہ رنگ ڈھنگ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ میری عمر کچھ بھی نہیں تھی جب میرے باپ کا سایہ میرے سر پر سے اٹھا، میری وضع دار ماں پر ناگہانی آپڑی اور وہ اپنی رہی سہی عزت بچانے کی تگ و دو میں مصروف تھی۔ ہمارا گھر ہم سے چھنا۔ دھن دولت، راج پاٹ ختم ہوا۔ ہمارے عزیز جو اتفاق سے آپ کے بھی رشتے دار ہیں ہمارے سروں پر ہاتھ رکھنے کی بجائے ہم پر انگلیاں اٹھانے لگے تھے۔ وہ لوگ جو میرے باپ کے پاؤں چومتے تھے ہمیں قدموں تلے روندنے کے لیے پر تولنے لگے تھے، ایسے میں آپ کا کیا خیال ہے میرا ردعمل کیا ہونا چاہیے تھا، کیا یہ خود ساختہ پابندی غلط تھی، میں جہاں بھی جاتی تھی، ماہین اور نگین کے بھوت میرا پیچھا کرتے تھے، سو میں اپنی ذات کے حصار میں قید ہونا زیادہ بہتر سمجھنے لگی۔ اسی میں عافیت تھی اسی میں مصلحت تھی۔ آپ کی آمد ہمارے لیے خوشی کا باعث تھی، آپ کی باتیں اور

تسلیاں کانوں کو اجنبی لگتی تھیں مگر دل کو سکون دیتی تھیں، آپ نے ہمارے مزاج اور رہن سہن کو بدلنے کے لیے وہ کیا جو سگے رشتے دار بھی نہیں کرتے، ہم شکر گزار ہیں۔ مگر معاف کیجئے گا وقتی فائدوں کے لیے انا اور خودداری کے سودے کرنے ہوتے تو آج کیا ہم اس حال میں ہوتے۔''

''یہ کس نے کہا۔'' ہمایوں چونک کر بولا ''چی جان کیا میں نے آپ اور دوسرے لوگوں میں اسی فرق کی نشاندہی نہیں کی۔''

''نگار کا مطلب یہ ہے کہ ہم ویسے تو ہرگز نہیں ہو سکتے جیسے لوگ تم نے ابھی بتائے ہیں، اور باقی میاں ہم کیا اور ہماری بساط کیا، تم لوگوں کا معیار ہو اور بقول تمہارے ہم تمہارا معیار ہیں جبکہ ہمارا تو اپنا دل ڈرتا ہے۔'' انہوں نے گہرا سانس لیا۔

''تو پھر کیا آپ مجھے اپنی فرزندی میں قبول کرنا پسند فرمائیں گی'' چی جان نے سر جھکایا۔

''کیسے ناشکرے ہیں ہم لوگ، کتنی جلدی مایوس ہو جاتے ہیں، میں بھی مایوس ہو کر اس لڑکے سے ہی ناراض ہونے لگی۔ شاید مجھے یہ خیال کبھی آیا ہی نہیں کہ کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے جو خود کو ہمارے قابل سمجھتے ہوئے ڈرتا ہو۔''

''آپ خاموش ہو گئیں، اس کا مطلب ہے میرا خوف ٹھیک تھا۔''

''نہیں میاں، میں نے کہا نا ہم کیا اور ہماری بساط کیا، تم ہی نے کہا تھا کہ نگار سے کہوں جاؤ اپنے لیے برخوردار ہی ڈھونڈ لو۔ یہ فیصلہ تو نگار کو ہی کرنا ہے۔ مگر ہم پر رحم یا احسان کے جذبے سے ایسا مت سوچنا، پھر تمہارے عزیز، رشتے دار ہیں جو اس فیصلے کا مذاق اڑائیں گے۔''

''کہئے مس آدم بیزار، وہ شخص جو آپ کے خیال میں ماہ رخ سے دوستی کر سکتا ہے، آپ کے معیار پر پورا اترے گا'' وہ ان کی بات ان سنی کر کے نگار سے مخاطب ہوا۔ نگار کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

''میں نے سارے کٹھن راستے امی کے لیے اختیار کیے تھے۔'' اس نے کہا۔

''تو ہم ان کو منفی تو نہیں کر رہے، میں انہی کی راہنمائی میں تو باقی کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ دونوں ماں بیٹی کی نظریں ملیں۔ وہ بے یقینی کی کیفیت سے دوچار تھیں۔ اتنے مہینوں سے ایک اضطراب سا بڑھ رہا تھا اس کا نتیجہ ان کی توقع کے برعکس تھا۔ وہ تو ہارنے کی عادی ہو چکی تھیں، نامراد رہ جانے سے دوچار ہونے کو مقدر سمجھے بیٹھی تھیں۔ پھر یہ اگر واقعی حقیقت تھی تو کتنی دل خوش کن تھی ''لو بی بی تو ہنسا، زحل کی نحوست ٹلی، اب تو مسکرا دو۔'' ماں کی نظروں نے کہا۔ نگار نے ارد گرد پھرتے، بیٹھے اور کھڑے ہنستے مسکراتے لوگوں کو دیکھا ''یہ رنگ اور یہ خوشیاں میرا مقدر بھی ہوں گی میں نے کب سوچا تھا، میں نے تو آج ہی سوچا تھا تم منفرد ہو مگر رسائی سے باہر، میری رسائی کا دائرہ کیسے وسیع ہو گیا۔ ہمایوں ان کی کیفیات کو سمجھ رہا تھا۔ اس نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر بہت جانچ پرکھ کر کیا تھا اس کے غلط ہونے کا شبہ اسے تھا ہی نہیں۔

''اٹھو بیٹا، اب چلیں۔'' چی جان نے بالآخر اس کے ہاتھ پر ہاتھ دھرا۔

انگلینڈ کے شہر برسٹل میں یہ کنبہ کئی سال سے آباد ہے۔ ہمایوں، نگار ہمایوں اور اس کی امّی اور اس کے دو بچے۔ یہ گھر دور سے ہی مشرق کی تہذیب کا گہوارہ نظر آتا ہے۔ چی جان کے اسٹور میں مقفّل نوادرات سے سجا، ہمایوں کے مزاج کا عکس، ان کے بچے اس دیارِ غیر کے مکین ہونے کے باوجود خالص محاوراتی اردو بولتے ہیں اور اپنی تاریخ سے مکمل طور پر آگاہ ہیں۔ یوں ہمایوں کا دم توڑتی روایات کو زندہ رکھنے اور یہ امانت اگلی نسلوں تک منتقل کرنے کا خواب حسن و خوبی سے تعبیر میں ڈھل رہا ہے۔

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ

آٹو گراف

محمد صفدر ہسٹری میں ایم اے کرنے کے بعد دو سال تک فارغ پھرتا رہا تھا۔ اس نے بہت سی جگہوں پر ملازمت کے لیے قسمت آزمائی تھی، مگر اچھی ملازمت اس کی قسمت میں نہیں تھی۔ وہ بے روزگاری سے تنگ آ چکا تھا۔ جب اس کے دوست شفیق نے اسے ایک نئی بننے والی ٹورسٹ کمپنی کے بارے میں بتایا تھا۔ اس نے اسے اس ٹورسٹ کمپنی کا ملازمت کے لیے شائع ہونے والا اشتہار بھی دکھایا تھا۔ کمپنی کو ڈرائیورز کی ضرورت تھی۔ یہ کمپنی رینٹ اے کار کا کام بھی کرتی تھی۔ محمد صفدر کو ڈرائیونگ آتی تھی اور اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس بھی تھا۔

وہ بے روزگاری سے اتنا تنگ تھا کہ اس نے اس کمپنی میں ڈرائیور کی ملازمت کے لیے درخواست دے دی۔ ایک ہفتے کے بعد اس کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا اور پھر اسے یہ ملازمت مل بھی گئی۔ اس کی تنخواہ کچھ بہت زیادہ نہیں تھی۔ مگر جس تنگ دستی میں اس نے پچھلے دو سال گزارے تھے۔ اس کے پیش نظر یہ تنخواہ بھی کافی معلوم ہوتی تھی۔ اور اب تو وہ یہ ملازمت انجوائے بھی کرنے لگا تھا۔ ہر روز اس کا واسطہ نئے نئے لوگوں سے پڑتا تھا اور وہ ان کے ساتھ نئی نئی جگہیں دیکھتا پھرتا تھا۔ اسے انگریزی کی بھی اچھی شد بد تھی اور تاریخ تو اس کا مضمون تھا ہی۔ کمپنی والے غیر ملکی سیاحوں کے لیے اس سے ڈرائیور کے ساتھ ساتھ ٹورسٹ گائیڈ کا کام بھی لے لیتے تھے۔

اس اضافی کام کی اسے اضافی تنخواہ بھی مل جاتی تھی۔ محمد صفدر کے گھر والے بھی خوش تھے اور محمد صفدر خود بھی، کہیں دور کے علاقے میں گھوم کر واپس آنے پر اس کے پاس اپنے گھر والوں کو سنانے کے لیے نت نئی کہانیاں ہوتی تھیں۔

غیر ملکی سیاحوں کی اس نے مختلف کیٹگریز بنا رکھی تھی۔ خالص انگریز گورا صاحب تھا۔ امریکی سیاح کو وہ پین ایم کہتا تھا۔ مشرق وسطیٰ سے آنے والے پھپھے صاحب تھے۔ سری لنکا والے گرم صاحب تھے۔

انڈیا سے آنے والے سردار جی، یا بنیا لوگ تھے۔ اسی طرح وہ اپنے ذہن کے مطابق اور خطوں کے حساب سے لوگوں کی شناخت قائم کرتا تھا۔ تاریخ کے حوالے سے اسے اپنا علم جھاڑنے کا جہاں بھی موقع ملتا تھا۔ وہ اس سے فائدہ ضرور اٹھاتا تھا۔ اکثر سیاح اور مقامی لوگ بھی جو محمد صفدر کے ساتھ ادھر اُدھر گھومنے نکلتے تھے اس کی تاریخ سے واقفیت پر حیران ہوتے تھے اور خوش بھی۔ کمپنی والے اس کی کارکردگی سے خوش تھے اور اکثر اپنے خاص کلائنٹس کو محمد صفدر کے ساتھ ہی کہیں بھیجتے تھے ان کا ایک بندے سے دو کام کروانے میں فائدہ ہو جاتا تھا۔

یہ دسمبر 2005ء کا واقعہ ہے، جب محمد صفدر کی تنخواہ میں اچھا خاصا اضافہ ہوا تھا، اور اس اضافے پر وہ بہت خوش تھا۔ اپنے کام میں وہ پہلے سے زیادہ سخت اور ذمہ دار ہو گیا تھا اور اس سب کو اللہ کی دین کہتا تھا۔

اوائل دسمبر کی کسی تاریخ کو کمپنی کے دفتر کی ریسپشن والی سیٹ پر عادل صدیقی صاحب کی ڈیوٹی تھی عادل صاحب نے محمد صفدر کو صبح صبح فون کیا تھا۔ وہ اسے جلد دفتر پہنچنے کا کہہ رہے تھے۔ محمد صفدر جلدی جلدی تیار ہو کر دفتر کے لیے نکل گیا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ کوئی خاص سیاح یا خاص قسم کا مقامی پارٹی دفتر آئی ہو گی جب ہی اسے خصوصی طور پر بلایا گیا ہے۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہوتا تقریباً ساڑھے سات بجے دفتر پہنچا تھا۔ سردی اس روز اپنے عروج پر تھی۔ دفتر کے گرم ریسپشن روم میں اس وقت عادل صاحب اور جمیل چپڑاسی کے علاوہ ایک مرد اور ایک خاتون بھی موجود تھیں۔

''یہ صاحب اور بیگم صاحبہ آج ہی لاہور تشریف لائے ہیں۔ لاہور دیکھنے کے لیے ان کے پاس ایک ہی دن ہے کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ ان کے ویزے کی مدت ختم ہونے والی ہے۔ ایک دن میں ان کو لاہور ٹھیک طرح سے دکھانے کا کام تم ہی کر سکتے ہو۔ دن چھوٹا ہے اور دیکھنے کو جگہیں بہت، سو بتاؤ تم کس طرح پیش کرو گے؟''

عادل صاحب کے کہنے پر محمد صفدر نے ایک نظر مرد و خاتون پر ڈالی۔ مرد نے قیمتی کپڑے کا گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور اس کے چہرے کے خدوخال سے فوری طور پر محمد صفدر کو اندازہ ہیں ہو رہا تھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہو سکتا تھا۔ مرد کے ساتھ بیٹھی خاتون درمیانی عمر کی تھی اور اس نے بھی بہت قیمتی ساڑھی باندھ رکھی تھی۔ ساڑھی کے اوپر اس نے گرم لانگ کوٹ بھی پہن رکھا تھا۔ اس کے کانوں اور گلے میں قیمتی زیور بھی موجود تھا اور اس کے نقش انتہائی تیکھے تھے۔ وہ عورت بہت باوقار انداز میں بیٹھی تھی۔ اس کے وجود سے کسی انوکھے مگر بہت قیمتی پرفیوم کی خوشبو آ رہی تھی اور سارے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔

محمد صفدر نے دونوں مہمانوں پر نظر ڈال لینے کے بعد عادل صاحب سے لاہور کا نقشہ نکالنے کی درخواست کی۔ نقشہ سامنے آنے پر اس نے کاربن پنسل سے کچھ جگہوں پر نشان لگائے اور اسی پنسل سے ان جگہوں کے روٹس واضح کیے۔

''بہت خوب!'' عادل صاحب نے بے اختیار کہا۔

''ہمارے مہمان تاریخی مقامات دیکھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ اور تم نے تاریخی مقامات کو ہی ہائی لائٹ کیا ہے۔ صفدر! تم تو خوب اس میدان میں پختہ ثابت ہونے لگے ہو۔''

محمد صفدر نے آداب بجالانے کے سے انداز میں ہاتھ ماتھے تک لے جا کر سر جھکایا۔

''ابھی نکلنا ہے سر؟'' پھر اس نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں۔'' عادل صاحب نے کہا۔ ''بس ذرا مہمان چائے پی لیں۔'' صفدر نے ایک بار پھر مڑ کر اس ادھیڑ عمر جوڑے کو دیکھا، جو اکڑ کر بیٹھے ان لوگوں کے مابین ہونے والی گفتگو سن رہے تھے۔ اس نے دیکھا۔ ان لوگوں کے سامنے رکھی چائے کی پیالیوں میں چائے کے اوپر سیاہ جھلی سی جم گئی تھی۔ گویا چائے آئے کافی دیر ہو چکی تھی۔

''آپ چائے پئیں سر!'' عادل صاحب نے مؤدب سے انداز میں سر جھکا کر ان دونوں کو مخاطب کیا۔

''اردو بول رہے ہیں، مطلب زیادہ سے زیادہ انڈیا سے آئے ہوں گے اور اگر کہیں کسی اور ملک سے بھی آئے ہوں تو رہنے والے یہیں کہیں کے ہیں۔'' صفدر نے فوراً قیاس کیا۔

''نہیں۔'' مرد نے بھاری آواز میں کہا۔ ''ہمیں چائے نہیں پینا، بہت نوازش اب ہم نکلنا چاہیں گے۔''

''جی ضرور سر!'' عادل صاحب نے اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ پھینکتے ہوئے کہا۔ اور اپنا رجسٹر کھول لیا جہاں انٹریز غالباً پہلے ہی سے ہو چکی تھیں۔

''کمپنی کی قیمتی ترین گاڑی آپ کی سواری کے لیے حاضر ہے سر اور کمپنی کا ذہین اور ماہر ترین ڈرائیور بھی۔ محمد صفدر تاریخ سے بہت اچھی واقفیت رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس کے ساتھ آپ کا دن بہت اچھا گزرے گا۔ اور آپ اپنی اس سیر سے لطف اندوز ہو سکیں گے۔'' عادل صاحب نے پیشہ ورانہ جملے ادا کیے۔

''قیمتی ترین گاڑی۔'' محمد صفدر کے کان کھڑے ہو گئے۔ ''گویا بھاری ادائیگی بھی ہوئی ہو گی۔ باپ رے! یہ تو کوئی بڑا صاحب لوگ ہے۔''

وہ بڑے لوگوں کے نخروں اور ناز و ادا سے بہت گھبراتا تھا۔ سیاحت کم کرتے اعتراض زیادہ، وہ باتونی آدمی تھا جب کہ ایسے مہمان اکثر اپنے دماغ میں رہتے ہوئے گفتگو سے پرہیز ہی کرتے تھے۔

''ایک بور دن۔'' محمد صفدر نے دفتر سے باہر آ کر گیراج میں کھڑی قیمتی ترین گاڑی نکالی۔ اگرچہ اسے اس گاڑی کو چلانے اور اس پر کسی مہمان کو سیر کرانے کا شوق رہتا تھا مگر اس روز وہ کچھ اتنا خوش نہیں تھا۔

چمکتی سیاہ بی ایم ڈبلیو ڈرائیو وے پر کھڑی تھی جب وہ دونوں صاحب و خاتون باہر نکلے۔ محمد صفدر نے دیکھا دونوں کی چال میں کوئی خاص بات تھی۔ خاتون مرد سے دو قدم آگے چل رہی تھیں۔ جب کہ صاحب دونوں بازو پیچھے باندھے انتہائی باوقار انداز میں اس کے پیچھے چل رہے تھے۔ محمد صفدر نے صبح کے اجالے میں

ان دونوں کے نقوش ایک مرتبہ پھر غور سے دیکھے تا کہ معلوم کر سکے کہ وہ اس کی بتائی ہوئی کس کیٹگری میں آتے تھے۔ ''ایران سے آئے لگتے ہیں۔'' مگر اردو کیسے بول رہے ہیں۔''

اس نے سوچا۔ ایران سے آئے ہوئے اکثر سیاح انگریزی بولنے سے بھی پرہیز ہی کرتے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا اور انتہائی ادب سے انہیں گاڑی میں بٹھایا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد وہ پیچھے سے گھوم کر ڈرائیور سیٹ والے دروازے کی طرف آیا۔ اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے حسب عادت بیک ویو مرر کو سیٹ کیا اور بسم اللہ پڑھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔

''ادھر سے ہم پرانے لاہور کی طرف جائیں گے صاحب۔ جہاں تمام تاریخی مقامات موجود ہیں۔ اس طرح سفر سے آپ کو نئے اور پرانے لاہور کے موازنے کا موقع بھی مل جائے گا۔'' محمد صفدر نے ان دونوں کے رعب سے مرعوب ہوا پنی تئیں، انتہائی مؤدب انداز میں کہا۔

''ہوں!'' عقب سے مرد کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی سے گاڑی چلانے کے بعد محمد صفدر اپنی باتونی طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر بول اٹھا۔

''آپ انڈیا سے آئے ہیں صاحب کہ ایران سے؟'' جواب میں خاموشی پر اس کا دل ڈر گیا۔ شاید برا مان گئے ہوں۔

''کیا پوچھا؟'' کچھ دیر بعد عقب سے خاتون کی آواز آئی۔ محمد صفدر نے اپنا سوال دہرا دیا۔

''ہم بہت سا راستے طے کر کے ہندوستان پہنچے تھے۔ ہمارا اصل وطن ترکی ہے۔ مگر ہم زیادہ تر ہندوستان میں ہی رہے اور اب۔'' مرد کی بھاری بارعب آواز آئی۔

''اور اب سر!'' صفدر کو اپنے قیافے کے غلط ہونے پر افسوس ہوا۔

''اب ہمارا کوئی خاص وطن نہیں ہے، اب ہم مسافروں کی سی زندگی گزارتے ہیں۔''

''بہت خوب سر!'' محمد صفدر نے مسکرا کر کہا اور دل میں قیافہ لگایا۔ ''امراء رروؤ ساء کا اس عمر میں یہ ہی مشغلہ تو رہتا ہے، پیسہ لگایا اور گھومتے پھرتے رہے۔ لگتا ہے بال بچوں کی ذمہ داریوں سے بھی فارغ ہو گئے دونوں۔''

''یہ کون سا علاقہ ہے؟'' عقب سے اب کے سوال آیا۔ گاڑی اس وقت کینال روڈ سے اپر مال کی طرف رواں تھی۔ ''یہ لبرٹی مارکیٹ ہے سر! اس سے آگے گلبرگ کا علاقہ ہے۔ یہ اس شہر کے جدید ترین علاقوں میں سے ایک ہے۔''

''ہوں!'' مرد کی آواز آئی۔ ''عمارات خاصی بلند ہیں، مگر کشادہ نہیں۔''

''سر! کمرشل ازم کا دورہ ہے۔ اب جگہ کم آسائش زیادہ کو ترجیح دی جاتی ہے۔'' صفدر نے جواب دیا۔

''کیا ایسی تنگ جگہوں میں ان لوگوں کا دم نہیں گھٹتا۔'' خاتون کی آواز آئی۔ صفدر نے بیک ویو مرر پر

نظر ڈالی خاتون کے چہرے پر نخوت کے آثار تھے۔

''لگتا ہے انڈیا میں کسی محل میں رہتی ہیں محترمہ!'' اس نے دل میں سوچا۔

''اب تو ایسی تنگ جگہوں کی آپ بھی عادی ہو چکی ہیں بیگم صاحبہ! مت بھولئے۔'' مرد نے خاصی دبی آواز میں کہا۔ مگر صفدر کے تیز کانوں نے پھر بھی سن لیا۔

''یہ ٹاورز ہیں بیگم صاحبہ! ان ٹاورز کی کئی منزلیں ہیں۔ ہر منزل پر کئی فلیٹ، کئی کئی دکانیں اور کئی کئی دفتر، لاہور بہت پھیل گیا ہے۔ آبادی بڑھ رہی ہے۔ اب رہنے کو گھر بنانے کو وسیع زمین نہیں ملتی سو ہم نے بھی ماڈرن یورپ اور ترقی یافتہ امریکہ سے یہ فن تعمیر مستعار لے لیا ہے۔ اب پاکستان پہلے جیسا پاکستان نہیں رہا۔ آپ دیکھ رہی ہیں۔ ترقی کے آثار نمایاں نظر آ رہے ہیں۔''

صفدر کو انڈیا کے مقابلے میں پاکستان کو پرموٹ کرنے کا خبط تھا اور اس سلسلے میں وہ اپنے کسی مہمان کا لحاظ نہیں کرتا تھا۔

''کبوتروں کی کابک سے ٹھکانے۔'' بیگم صاحبہ ماتھے پر بل ڈال کر بولیں۔ ''اور راستے دیکھیے آمدورفت کا ایک سیلاب ہے۔ جو بہے چلا جا رہا ہے۔ کیا سب گاڑیاں یہاں کے رہنے والوں کی ہی ہیں۔ بہت بڑی اور بہت جدید ذرائع آمدورفت ہیں۔''

''آپ ٹھہریں ان چھوٹی چھوٹی صابن دانی نما گاڑیوں کو دیکھنے کی عادی جو آپ کے ہندوستان کی سڑکوں پر ادھر اُدھر بھاگتی پھرتی ہیں اور وہ بے چارے انسانوں کو کھینچی جانے والی ہتھ گاڑیوں کی جو انسانیت کی تذلیل کا نادر نمونہ ہیں۔''

محمد صفدر نے دل ہی دل میں استہزائیہ انداز میں کہا۔

''جی بیگم صاحب! یہ ان لوگوں کی ذاتی انشورڈ گاڑیاں ہیں۔ لیزنگ۔'' پھر اس نے اسٹیئرنگ ویل پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''لیزنگ زندہ باد، اب تقریباً ہر تیسرا پاکستانی شہری گاڑی کا مالک ہے۔''

''پاکس تان.....'' مرد بڑبڑایا۔ ''پاکس تان کی تاریخ سے واقف ہو تم کچھ؟''

''کیوں نہیں صاحب!'' محمد صفدر اب خوش تھا اس کے مہمان گفتگو پر اتر آئے تھے۔ ''پاکستان سر، سب سے پہلے پاکستان، ایم پاکستانی، پاکستان کی تاریخ سے واقف نہ ہوں گے تو اور کون ہوگا۔'' گاڑی اب اپر مال کے نزدیک پہنچ چکی تھی۔

''یہ سارے تختے کیوں راستے کے کنارے جگہ جگہ نصب کیے گئے ہیں؟'' خاتون نے ایک بل بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''ہو ہو!'' صفدر کا دل قہقہے مارنے لگا۔ ''لگتا ہے انڈیا اس معاملے میں بھی مار کھا گیا۔''

''یہ ایڈورٹائزنگ بورڈز ہیں بیگم صاحبہ! مصارف کی، پبلسٹی کے لیے لگائے گئے ہیں۔'' آپ جانیں۔ آج کا دور تو ہے ہی پبلسٹی اور مارکیٹنگ کا دور۔''

''ہوں؟'' خاتون کچھ سوچتے ہوئے بولیں۔ ''اور ہر تختہ پر یوں مرد و زن کا ملاپ سرعام کیوں دکھایا جا رہا ہے؟''

''لو جی یہ تو ہم نے امریکہ، برطانیہ سے زیادہ تمہارے انڈیا سے ہی سیکھا ہے۔ اور تم پوچھ رہے ہو کہ یہ سرعام کیوں دکھایا جا رہا ہے۔ ستی ساوتری کہیں کی۔'' محمد صفدر نے دل میں کہا۔

''ٹرینڈ ہے نا بیگم صاحبہ، مارکیٹنگ کے بھی اپنے ٹرینڈز ہیں آپ تو دنیا بھر کے تمام ممالک میں گئی ہوں گی آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر جگہ اس شعبے میں تقریباً ایسے ہی ٹرینڈز چل رہے ہیں۔'' اب کے اس نے باآواز بلند جواب دیا۔

''تف ہے ایسے لوگوں پر۔'' پیچھے سے دبی دبی آواز آئی۔

''جی بیگم صاحبہ! آپ نے کچھ فرمایا۔''

خاتون نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر مرد نے ان کا ہاتھ دبا کر انہیں خاموش کرا دیا۔

''ان کا مطلب ہے کہ ابھی تم بتا رہے تھے کہ تمہارا یہ ملک اسلام کے نام پر بنا، اسلام ان چیزوں کی اجازت دیتا نہیں اسی لیے بیگم صاحبہ جز بز ہوئیں۔''

''اوہ!'' اب کے محمد صفدر کو بیگم صاحبہ کی ناراضی کی وجہ سمجھ میں آئی۔

''دراصل دنیا میں ترقی کی جو دوڑ لگی ہے نا سر! اس میں سروائیو کرنے کے لیے ٹرینڈز کو فالو تو کرنا ہی پڑے گا۔''

''ہوں!'' مرد نے کہہ کر کھڑکی سے باہر کی دنیا پر نظریں جما لیں۔ صفدر کو محسوس ہوا کہ انہیں اس کی بات کچھ خاص سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

''پاکستان 1947ء میں بنا جی، پہلے ہندوستان، پاکستان اکٹھے ہی تھے۔ آپ کو معلوم ہوگا۔ یہ ادھر واہگہ میں بارڈر ہے جی دونوں ملکوں کے، ادھر ہمارے فوجی ادھر ان کے کھڑے رہتے ہیں۔ یہ مشرقی جرمنی اور مغربی جرمنی تو علیحدہ علیحدہ رہنے کے بعد اب اکٹھے ہو گئے ہیں نا جی۔ ہندوستان پاکستان اکٹھے رہنے کے بعد علیحدہ ہو گئے۔'' صفدر کو باتوں کا چسکا تھا وہ خاموش کیسے رہتا۔ سو صاحب کے اس سوال کا تفصیل سے جواب دینے لگا جو وہ پاکستان کی تاریخ کے متعلق پوچھ رہے تھے۔

''کیا ضرورت پیش آئی۔ اکٹھے رہتے رہتے علیحدہ ہونے کی؟'' صاحب نے پوچھا، یہ سوال یہاں آنے والے اکثر مہمان کرتے تھے۔ محمد صفدر مسکرا کر گویا ہوا۔

''سر! ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں تھیں۔ ان کی زبان، ثقافت، رسم و رواج سب سے بڑھ کر

مذہب مختلف تھے۔ ان کی تاریخ مختلف تھی اس لیے مسلمانوں کے لیڈروں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ ٹینشن مزید بڑھے علیحدہ ہو جانا چاہیے۔''

''اور ہندو نے کیا سوچا؟'' عقب سے سوال آیا۔

''ہندو.....'' صفدر نے بلند آواز میں کہا۔ ''وہ تو سالے اس چکر میں تھے کہ انگریز یہاں سے رفو چکر ہو اور ہم مسلمانوں پر حکومت کا اپنا پرانا خواب پورا کر لیں۔'' ہندوؤں نے بڑے سال مسلمانوں کی غلامی میں جو گزارے تھے وہ اس غلامی کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔''

محمد صفدر نے دل ہی دل میں حیران ہوتے ہوئے کہا کہ وہ حیران اس بات پر تھا کہ مہمان اپنا تعلق انڈیا سے بھی بتاتے تھے اور ان ممالک کی تاریخ اس سے یوں پوچھ رہے تھے جیسے کچھ بھی نہیں جانتے تھے۔

''کتنے برس حکومت کی مسلمانوں نے ہندوؤں پر؟'' پیچھے مردانہ آواز آئی۔

''تقریباً ایک ہزار سال۔'' محمد صفدر نے ٹریفک لائٹس پول پر سرخ بتی جلنے پر گاڑی کے بریک پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے اردگرد گاڑیوں کی قطاریں کھڑی تھیں۔ صبح کا وقت تھا اور دفتر، سکول، کالج جانے والوں کا رش تھا۔

''کیا ہندو مسلمان حکمرانوں سے ناخوش تھے؟'' پیچھے سے ایک اور سوال آیا، محمد صفدر نے جواب دینے سے پہلے ایک نظر بیک ویو مرر پر ڈالی۔ خوش شکل خاتون کی پیشانی پر اب بھی بل پڑے تھے۔ اور وہ نخوت سے اردگرد کا منظر دیکھ رہی تھیں۔ جب کہ صاحب کے چہرے پر ٹھہراؤ تھا۔

''ایسے ویسے ناخوش۔'' اس نے اشارہ کھلنے پر گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''سر! ان کا بس چلتا تو وہ مسلمانوں کو کچا ہی چبا ڈالتے۔ قیام پاکستان کے وقت جو سلوک ان ہندوؤں اور سکھ جاہلوں نے مسلمانوں کے ساتھ کیا ان کی کہانیاں پڑھ کر تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں انسان کے۔''

''کیوں کیا یہ ظلم انہوں نے؟'' محمد صفدر نے دیکھا۔ صاحب کے چہرے پر اضطراب کی لہر ابھری۔

''وہ کہتے تھے کہ یہ ان کی سرزمین تھی جن پر مسلمانوں نے زبردستی قبضہ کیے رکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمان حکمرانوں نے ہندو جنتا پر ظلم روا رکھے اور ناانصافیاں کیں ان کے ساتھ۔''

''کیا یہ تاریخ یوں لکھی گئی؟'' صاحب نے پوچھا۔ ان کے چہرے پر ابھی بھی اضطراب تھا۔

''اس تاریخ کے مؤرخ کون تھے؟''

''بہت سے تو بادشاہانِ ہند کے درباری مؤرخ تھے کچھ آؤٹ سائیڈرز بھی تھے۔ صاحب پہلے کس طرف چلیں؟'' محمد صفدر نے واپڈا ہاؤس کے قریب پہنچ کر پوچھا۔

''یہاں سے ہی وہ تاریخی عمارات شروع ہو جاتی ہیں جن کو دیکھنے کا آپ کو اشتیاق ہے۔ یہ تاریخی

مال روڈ ہے۔ جناب انگریز کے دور کی یادگار، یہ ادھر دائیں ہاتھ جو مینار سا نظر آ رہا ہے آپ کو یہ سمٹ مینار کہلاتا ہے۔ مسلمان حکمرانوں کی کانفرنس کی یاد میں بنایا گیا اور یہ پیچھے پنجاب اسمبلی کی عمارت ہے۔ اب ہم آگے جا رہے ہیں۔ دائیں بائیں جتنی پرانی عمارتیں نظر آ رہی ہیں سر! سب انگریز کے دور کی یادگار ہیں۔''

''کیا انگریز، انگریز کئے جا رہے ہو۔'' خاتون نے تنک کر پوچھا۔ محمد صفدر اپنے آپے میں واپس آ گیا اور سنبھل کر گاڑی چلانے لگا۔

''فرنگیوں کی بات کر رہا ہے۔'' مرد نے ایک مرتبہ پھر دبی آواز میں کہا۔ مگر محمد صفدر نے سن لیا۔ ''لگتا ہے بیگم صاحبہ ذرا بھی پڑھی لکھی نہیں۔ یہ ناز نخرہ و ناز ادا بس پیسے کی دین ہے۔''

''اس انگریز کے دور سے پہلے کے کچھ نشانات باقی ہیں یا نہیں۔'' اس کے مرد نے محمد صفدر سے پوچھا۔

''نشانات تو زیادہ تر میوزیم میں نظر آئیں گے سر آپ کو۔ کہیے آپ کو وہاں چلنا ہے کیا؟'' صفدر نے دیکھا دونوں نے ایک دوسرے کی طرف استفہامیہ نظروں سے دیکھا۔

''چلو۔'' کچھ دیر متردد نظر آنے کے بعد بالآخر مرد نے فیصلہ کیا۔ محمد صفدر نے میوزیم کے آگے گاڑی کھڑی کی اور دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ باادب انداز میں پچھلی نشست کا دروازہ کھول کر ذرا سا جھکا۔ وہ دونوں باہر آ گئے۔ جھک کر باہر نکلنے پر خاتون کے گلے میں پڑے زیور پر صفدر کی نظر پڑی۔ وہ یقیناً خالص سونا تھا اور اس پر نقش ڈیزائن کسی ماہر فن کے ہاتھ کی مہارت کی جھلک دکھلا رہے تھے۔ وہ مزید مؤدب ہوا۔

''ہمیں معلوم ہوا تھا کہ تم گاڑی بان ہی نہیں، ایک اچھے تاریخ شناس بھی ہو۔ بہتر ہو گا کہ تم ہمارے ساتھ ہی چلو۔'' مرد نے اپنا لباس درست کرتے ہوئے کہا۔

''گاڑی بان!'' محمد صفدر کے کان کھڑے ہوئے۔ ''کیا لقب ہے، وہ آج تک ڈرائیور یا شوفر تو کہلایا جاتا رہا تھا مگر اسے گاڑی بان کے نام سے کسی نے مخاطب نہیں کیا تھا۔

''ممکن ہے ترکی زبان میں ڈرائیور کو یہی کہتے ہوں۔'' اس نے سوچا اور گاڑی ایک سائیڈ پر لگا کر ان کے ہمراہ اندر چلا۔ ٹکٹ خریدنے کے لیے پیسے بھی انہوں نے ہی دیئے۔ میوزیم مختلف لوگوں سے بھرا پڑا تھا۔ محمد صفدر ان کو میوزیم کے مختلف ہالز میں لے کر گیا اور ہر ہال کے متعلق انہیں تفصیل سے بتایا۔

اس دوران وہ دونوں آپس میں ایک ایسی زبان میں گفتگو کرتے رہے جو محمد صفدر کی سمجھ نہیں آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ تقسیم سے پہلے کے ہندوستان کی تاریخ اور اس سے متعلق نوادر میں انہوں نے خاص دلچسپی لی اور اس کے متعلق سوالات بھی پوچھتے رہے۔ ''شاید اس موضوع پر کوئی کتاب لکھنے کا ارادہ ہے ان کا۔'' صفدر نے ایک اور قیافہ لگایا۔

''کہیں اور چلتے ہیں۔'' وہ جب انہیں پاکستان کی ثقافت کے نمونے دکھانے لگا تو وہ فوراً بولے۔

''جی سر!'' اس نے سندھ کے بارے میں بتانے کے لیے الفاظ جمع کرنے کا سلسلہ منقطع کیا اور ان

کے ہمراہ باہر نکل آیا۔ باہر دن اچھا خاصا نکل آیا تھا اور سنہری دھوپ پھیل رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ آپ شاہی قلعہ دیکھنا پسند فرمائیں گے سر! بادشاہی مسجد اور شالامار باغ، قطب الدین ایبک کا مزار۔'' اس نے اب تک ان کے مزاج کا جو اندازہ لگایا تھا، اس کے مطابق کہنا شروع کیا۔

''قطب الدین ایبک!'' مرد نے چونک کر کہا۔ سلطان قطب الدین ایبک۔''

''جی سر! بالکل وہی سلطان ہند قطب الدین ایبک۔ یہ ادھر پنجاب یونیورسٹی کے پچھواڑے انارکلی بازار ہے اور پرانی انارکلی میں ہی ایبک روڈ پہ سلطان آسودۂ خاک ہے۔''

''انارکلی بازار!'' مرد نے مزید چونک کر کہا۔

''جی سر! انارکلی بازار۔'' محمد صفدر نے مسکرا کر کہا۔ ''یہ بازار مغلیہ دور کی مشہور عشقیہ داستان کے کردار انارکلی کے نام سے منسوب ہے۔''

''عشقیہ داستان؟'' خاتون نے تعجب سے کہا۔

''شہنشاہ ہند جلال الدین اکبر کے بیٹے نور الدین جہانگیر کی عشقیہ داستان جسے ایک شاہی کنیز انارکلی سے عشق ہو گیا تھا۔ وہ اس سے شادی پر مصر تھا۔ جب کہ شہنشاہ کو یہ گوارا نہ تھا اس کے منع کرنے پر بھی جب شہزادہ اپنی ضد چھوڑنے پر تیار نہ ہوا تو شہنشاہ نے بدقسمت انارکلی کو زندہ دفن کروا دیا۔

کچھ مؤرخ کہتے ہیں کہ اسے دیوار میں زندہ چنوا دیا گیا۔ جبکہ کچھ کا کہنا ہے کہ زندہ دفن کر دیا گیا۔ اس لازوال کردار کے نام سے بازار منسوب ہے۔ کیونکہ کچھ مورخین کے خیال میں یہیں کہیں انارکلی کا مزار موجود ہے۔ کچھ کے خیال میں اس کا مزار وہاں ہے جہاں اب سول سیکرٹریٹ کی عمارت ہے۔'' صفدر کی زبان تیزی سے چلنے لگی۔

''انتہائی بے ہودہ، سراسر لغو۔'' خاتون نے غصے سے کہا۔

''یہ کون مؤرخ ہیں جنہوں نے یہ تاریخ لکھی۔'' مرد کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آ رہے تھے۔

''یہ قصہ ابتداء میں تو یورپین یعنی مغربی مؤرخین نے رقم کیا۔ ایک کا نام تو تیج تھا۔ دوسرا غالباً البرٹ تھا۔''

''ابوالفضل، عبدالقادر بدایونی اور بخشی نظام الدین سے زیادہ مستند مؤرخین ہیں کیا یہ مغربی مؤرخ؟'' خاتون نے گرج کر کہا۔ ''اور کیا بعد کی دنیا نے تزک جہانگیری میں اس لغو واقعہ کا کوئی حال پڑھا؟''

صفدر نے ڈرتے ڈرتے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ خاتون کا رنگ غصے سے قدھاری انار کا سا ہو گیا تھا اور صاحب بے بسی کے عالم میں ہونٹ کچل رہے تھے۔ غالباً وہ اپنی بیوی کے ناشائستہ ردعمل پر شرمندہ ہو رہے تھے۔

''صاحب! اگر یہ واقعہ مستند نہ ہوتا تو آج چہار عالم میں اس کی اتنی دھوم بھی نہ ہوتی۔ برصغیر پاک و ہند

میں اس نام پر، اس قصہ پر کئی عظیم الشان فلمیں بن چکی ہیں۔ تھیٹر، ٹی وی پر کئی ڈرامے، عشق و حسن کی یہ لازوال داستان یہاں کے لوگوں کے دل پر لکھی ہے۔ اس بازار کی وہ شہرت اور مقبولیت بھی اسی وجہ سے ہے۔'' ان کی حالت دیکھ کر صفدر کو حوصلہ ہوا اور وہ اپنی بات کہنے سے نہیں ڈرا۔

''تم لوگوں کا خیال ہے بادشاہ اور شہزادوں کے پاس اتنا فالتو وقت ہوتا تھا کہ وہ کنیزوں سے عشق لڑاتے پھریں۔ سلطنت ہند کا سلسلہ کہاں سے کہاں تک پھیلا تھا۔ اس کا اندازہ بھی ہے تمہیں، اتنی وسیع سلطنت کا انتظام سنبھالتے تھے بادشاہ کہ عشق میں مبتلا رہتے تھے۔'' خاتون مزید چلا کر بولیں۔

''آپ جو بھی کہیں بیگم صاحبہ تاریخ میں یہ ہی لکھا ہے خصوصاً شہزادہ سلیم کے حوالے سے جو سنا ہے بہت عاشق مزاج اور رقص و سرود کا دلدادہ تھا۔ اپنی مشہور عالم ملکہ نور جہاں سے بھی تو اس نے عشق میں مبتلا رہ کر شادی کر لی تھی اور اس کے لیے اسے اس کے پہلے خاوند سے طلاق دلوانے سے بھی دریغ نہیں کیا تھا۔''

''ہم پوچھتے ہیں کہ کیا تمہارے مؤرخین کو شہزادوں اور بادشاہوں کی زندگیوں میں صرف عشق و عاشقی کے کھیل ہی نظر آئے انہیں ان کا کوئی دوسرا کارنامہ نظر نہیں آیا؟'' خاتون یہ بات سن کر مزید اشتعال میں آ گئیں۔

''یہ ان لوگوں کی ذاتی نجی زندگیاں تھیں، بیگم صاحبہ محقق اور تنقید نگار تو شخصیات کی زندگیوں کا ہر پہلو ٹٹولتے ہیں نا۔'' محمد صفدر اپنی بات پر بضد رہا۔'' آپ انارکلی بازار کی ایک جھلک دیکھنا پسند کریں گے صاحب؟''

''ہرگز نہیں۔'' خاتون چلائیں۔ ''شاہی محل کی ادنیٰ کنیزوں کے نام پر بازار اور عمارتیں کھڑی کرنے والوں کو شہزادیاں اور ملکائیں شاید بھول گئیں جن کے مزار غلاظت سے اٹے رہتے ہیں اور جہاں کتے لوٹتے ہیں۔ ایسے احمق منتظمین کی بنائی ہوئی جگہیں دیکھنے کا ہمیں کوئی شوق نہیں۔''

محمد صفدر نے ایک نظر مشتعل خاتون کے ساتھ بیٹھے صاحب پر ڈالی۔ ان کے چہرے پر تفکر اور بے بسی عیاں ہو رہی تھی۔ ان کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔ اس نے گاڑی لوئر مال سے دائیں جانب موڑ لی اور انہیں شاہی قلعہ دکھانے لے جا رہا تھا۔

''یہ راستے اتنے تنگ اور پرہجوم کیوں ہیں۔ شاہی قلعہ کا راستہ تو ہمیں بخوبی معلوم ہے۔ یہ تم کہاں لے جا رہے ہو؟''

''آپ پہلے یہاں کب آئے تھے؟''

محمد صفدر نے حیرت کا اظہار۔

''اب تو لگتا ہے صدیاں بیت گئیں۔ بہت پرانی بات ہے۔'' انہوں نے سرد آہ بھر کر اپنی سیٹ کی پشت سے سر ٹکا لیا۔ محمد صفدر ان عجیب و غریب مہمانوں کی عادات اور گفتگو پر حیران ہو رہا تھا۔

''داتا گنج بخش کا مزار بھی راستے میں پڑتا ہے سر! دیکھنا پسند فرمائیں گے۔'' صفدر نے کہا اور گاڑی کا گلوو باکس کھول کر کچھ تلاش کرنے لگا۔ اس کی نظر وہاں رکھی ایک سی ڈی پر پڑی۔ اس نے گاڑی میں لگے ایل سی ڈی سکرین والے منی ٹی وی کو دیکھا۔

''داتا گنج بخش حضرت علی ہجویریؒ'' مرد نے چونک کر پوچھا۔

''جی سر!'' صفدر نے سی ڈی سیٹ کرتے ہوئے کہا۔

''دریائے راوی کا کنارہ کہاں ہے؟''

''دریائے راوی سر! وہ تو بہت دور ہے۔ جناب اور اب تو خشک ہو گیا ہے بے چارا بڈھا دریا۔''

''بہت دور ہے، ارے بھئی وہ تو یہیں تھا کہیں۔'' مرد نے ادھر اُدھر متلاشی نظروں سے دیکھا۔

''ہم داتا صاحب کے مزار کے سامنے سے گزر رہے ہیں سر! دیکھیے کتنا وسیع احاطہ ہے اور روزانہ سینکڑوں زائرین زیارت کے لیے آتے ہیں یہاں؟''

''سینکڑوں؟'' مرد پھر چونکا۔ ''ہاں!'' پھر جیسے اسے سمجھ میں آ گیا۔ ''یہ ذرائع آمد و رفت بہت ہیں۔ بے حد ہجوم ہے یہاں بھی۔ ہم نے یہاں بیٹھے بیٹھے ہی دعا پڑھ لی۔ تم شاہی قلعہ اور بادشاہی مسجد کا قصد کرو۔''

''بہت بہتر حضور!'' صفدر نے گاڑی کی رفتار ذرا بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی انارکلی کا ذکر ہو رہا تھا۔ آپ کو میں اس سکرین پر اس لازوال داستان پر بنا تازہ ترین گانا دکھاتا ہوں۔'' اس نے بٹن پش کیا۔ سکرین پر مغلیہ دور کے مناظر کے سیٹس نظر آنے لگے۔

''شہنشاہ من، مہاراج من۔

''نہ ہی تخت نہ ہی تاج شاہی نہ زر نہ دھن۔''

مغنیہ کی آواز آئی۔ صفدر نے کن انکھیوں سے بیک مرر پر نظر ڈالی۔ وہ دونوں مبہوت سے بیٹھے سکرین کی طرف دیکھ رہے تھے۔

''مغل اعظم ظل الٰہی۔''

مہابلی تیری دیکھ لی شاہی۔''

مغنیہ کی آواز آئی۔

ایمان علی انارکلی کے روپ میں زنجیروں میں جکڑی فریاد کر رہی تھی۔ پھر منظر بدلا اور شہزادہ سلیم انارکلی کے مزار کا نقشہ دیکھتا نظر آیا۔

آہ گر من باز بینم روئے یا خویش را
تا قیامت شکر گویم کردگار خویش را

چند لمحے بعد پس منظر میں جہانگیر کا کہا شعر سنائی دیا۔ صفدر نے دیکھا صاحب ٹی وی پر شعر دہرائے جانے کے ساتھ ساتھ خود بھی یہ شعر دُہرا رہے تھے اور پھر انہوں نے آنکھیں بند کر کے سر جھکا لیا۔

''بند کرو یہ بکواس، یہ لغو من گھڑت کہانی۔'' خاتون نے گرج کر کہا۔ صفدر نے گھبرا کر بٹن دبا دیا۔

''شاہی مسجد کے گنبد دکھائی دے رہے ہیں۔'' گاڑی کے ٹرن لیتے ہوئے اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ ''اس کی تعمیر مغل بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں ہوئی۔''

''درست فرمایا آپ نے، شاہ جہاں کو انجینئر بادشاہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے اور عہد مغلیہ کی کوئی یادگار عمارت ایسی نہیں جو فن تعمیر کا اعلیٰ نمونہ نہ ہو آج بھی ان کی شان و شوکت کا کوئی ماہر فنِ تعمیر مقابلہ نہیں کر سکتا۔''

''ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے اس جدید دور کی تعمیر شدہ عمارتوں میں فن تعمیر کی بہت سی غلطیوں کی تو ہم ایسے ناتجربہ کار بھی نشاندہی کر سکتے ہیں۔'' مرد کے چہرے پر تمسخر آمیز مسکراہٹ تھی۔

''کیوں بیگم صاحبہ، عالم گیر کے فن تعمیر کے ذوق کی داد دینا پسند فرمائیں گی آپ؟'' پھر اس نے خاتون کو مخاطب کیا جو غالباً اب تک ایمان علی کی فریاد اور شہزادہ سلیم کے عشق کی انتہا کے مظاہرے پر مشتعل تھیں۔ منہ سے جواب دینے کے بجائے انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''یہ سامنے مینار پاکستان ہے اور یہاں حکیم الامت علامہ اقبال کا مزار۔'' صفدر نے مسجد کی سیڑھیاں چڑھ کر صحن میں داخل ہونے سے پہلے اشارہ کیا۔ مگر ان دونوں کی نظریں تجسس سے مسجد کے اندرونی حصے پر جمی تھیں سو وہ جوتے اتار کر ان کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

''خوب، بہت خوب!'' صاحب نے ادھر اُدھر گھوم کر دیکھتے ہوئے بے ساختہ کہا۔ ''ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی بے چین طبیعت کو اب جا کر کچھ سکون ملا تھا۔ خوشی اور سکون کا احساس ان کے چہرے سے عیاں تھا۔

''مؤرخ کہتے ہیں کہ یہ سنگ سرخ جو اس مسجد کی تعمیر میں استعمال ہوا دراصل داراشکوہ نے چوک داراشکوہ سے لے کر مزار حضرت میاں میر تک ایک پختہ سڑک بنوانے اور حضرت صاحب کا مزار تعمیر کرانے کی غرض سے منگوایا تھا مگر قتل کر دیا گیا۔ لہٰذا اس کی خواہش تشنہ رہ گئی۔ عالم گیر نے یہ سنگ سرخ ضبط کر لیا۔''

صفدر بولے بغیر نہ رہ سکا۔

''بڑے ظالم تھے یہ تمام مغل بادشاہ، تخت شاہی کی خاطر سگے بھائیوں کو مروا دیتے تھے اور مخالفت کرنے والوں کا زن بچہ کولھو میں پلوا دینے کا حکم دے دیتے تھے۔ اللہ معاف کرے جی۔''

مرد کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر ایک تمسخر آمیز مسکراہٹ ابھری۔ مسجد کو دیکھنے اور اس کی دیواروں پر ہاتھ پھیر پھیر کر ان کی خوبصورتی محسوس کرنے میں دونوں نے پونا گھنٹہ لگا دیا۔ صفدر کو اس سڑک پر ہمہ وقت

موجود رہنے والے رش سے خطرہ تھا۔ وہ ایک انتہائی قیمتی گاڑی لے کر ادھر نکلا تھا۔ گاڑی پر پڑنے والی ذرا سی خراش بھی اسے کافی مہنگی پڑ سکتی تھی۔

''ہمیں خوشی ہے کہ مغل بچوں نے اپنے آباو اجداد کی بہت سی عادات اپنائیں اور ایک مخصوص مزاج کو پنپنے کا موقع فراہم کیا۔''

مرد نے مسجد سے نکل کر جوتے پہنتے ہوئے خاتون کو مخاطب کیا۔ وہ بہت کم آپس میں اردو زبان میں بات کر رہے تھے مگر یہ جملہ خالص اردو میں کہا گیا تھا۔ اب وہ شاہی قلعہ کی جانب رواں تھے۔ شاہی قلعہ کی بلند و بالا فصیل نظر آتے ہی مرد کی آنکھوں میں بے چینی اور چمک نظر آنے لگی جبکہ خاتون کے چہرے پر حیرت اور بے یقینی تھی۔ شاہی قلعہ کے مستی گیٹ کے باہر خورد نوش کی سستی اشیاء بیچنے والوں کا ہجوم تھا۔ بچوں کے کھلونے اور ٹافیاں فروخت کرنے والے بھی موجود تھے۔ یہاں بھی صفدر کو ان کے ساتھ ہی اندر جانا پڑا۔ وہ اس قیمتی گاڑی کی وجہ سے متردد تھا مگر اسے وہاں اپنے محلے کا ایک دوست مجید نظر آ گیا جسے گاڑی کی حفاظت پر مامور کر کے وہ اپنے مہمانوں کے ساتھ شاہی قلعے میں داخل ہو گیا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی سیاحوں کے ہمراہ یہاں آ چکا تھا۔ قلعے میں گھومتے پھرتے اس کی زبان فرائے سے چلتی رہی۔

''قلعے کی تعمیر بادشاہ اکبر کے دور میں ہوئی۔ جھروکہ بادشاہ اکبر نے تعمیر کروایا۔ دیوان عام شاہ جہاں نے، اکبری محل بادشاہ جہانگیر کی یادگار ہے۔ مکاتب خانہ اور خواب گاہ بھی جہانگیر نے تعمیر کروائے۔ شیش محل شاہ جہاں نے بنوایا۔ آئینہ کاری، پچی کاری، سنگ مرمر، سنگ بری، سنگ مریم، سنگ سیاہ۔''

وہ ایک ماہر ٹورسٹ گائیڈ کی طرح رٹی رٹائی باتیں کر رہا تھا جبکہ اس کے مہمانوں کے چہروں پر رنج، حیرت، افسوس اور مایوسی کے رنگ نمایاں ہو رہے تھے۔ وہ یقین نہ کرنے والی نظروں سے وہ سب دیکھ رہے تھے۔

دیوان عام، دیوان خاص، شاہ برج، شمن برج، ہاتھی پوڑ، نولکھا، دوسری منزل، تیسری منزل، شاہی حمام، بیت الخلاء، کلا برج، دیوان عام کے چبوترے کے قریب پہنچ کر وہ دونوں بے دم سے ہو کر بیٹھ گئے۔ صفدر نے محسوس کیا۔ دونوں کی نظریں گویا کچھ کھوج رہی تھیں تلاش کر رہی تھیں۔

''مغلوں کی تعمیر کردہ ان عمارتوں نے ٹورازم کو فروغ دینے میں بڑا کردار ادا کیا۔ دور دور سے لوگ ان عمارتوں کو دیکھنے کے لیے آتے ہیں سر! جیسے بھی ظالم تھے یہ بادشاہ سرگمر تھے بڑے باذوق اور ٹیکنیکل مائنڈڈ۔''

صفدر کی زبان پھر چلی۔ وہ دونوں بے دم سے اس کی لن ترانیاں سنتے رہے۔

''سنا ہے صاحب کہ اسی شہر لاہور میں بادشاہ جہانگیر نے اپنے بیٹے خسرو کی بغاوت پر اسے سزا دینے کا انوکھا ڈھنگ اپنایا۔ تقریباً ساڑھے سات سو سولیاں گاڑی گئی تھیں۔ جگہ جگہ باغی کے ساتھیوں کو سزا دینے

کے لیے اور خسرو کو گھوڑے پر بیٹھا کر یہ عبرت ناک منظر دکھایا گیا۔ کیا وحشی پن تھا جی مزاج میں۔''

صفدر کی اس بات پر صاحب نے اپنی بھاری غلافی آنکھیں اٹھا کر اسے دکھ کے ساتھ دیکھا۔ ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

''اس کے دو خاص ساتھیوں کو گدھے اور خچر کی کھالوں میں زندہ سلوا کر دم مار دیا جی ان کا۔'' صفدر نے پروانہ کرتے ہوئے مزید گوہر افشانی کی۔

''اس عمارت میں جڑے ہیرے جواہرات اور پچی کاری کے نادر نمونے کیا ہوئے؟'' مرد نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''وہ تو جی سکھ لے گئے ساتھ، جب انہیں لاہور میں شکست ہوئی۔ کچھ قیام پاکستان کے وقت گنوایا گیا، بڑی لالچی قومیں ہیں جی۔''

''ہوں۔'' صاحب نے دور کہیں خلاؤں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے جواب دیا۔ اسی دم ایک فوٹو گرافر ادھر کو آیا۔

''فوٹو گراف صاحب!'' اس نے گلے میں لٹکا کیمرہ اٹھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں۔'' صفدر سے پہلے صاحب بول پڑے۔

''دال خستہ کراری۔'' ایک اور شخص سلور کا ڈول اٹھائے ادھر کو آیا۔

''کیا کام کرتے ہو؟'' صاحب نے اس شخص کو دیکھ کر پوچھا۔

''دال بیچتا ہوں سر۔''

''گزارہ ہو جاتا ہے۔''

''بہت مشکل سے صاحب! کرائے کا گھر ہے، پانچ بچے، ایک میری بیوی اور ماں باپ۔ بہت مشکل سے گزارا ہوتا ہے صاحب!''

صاحب نے تاسف کے ساتھ اسے دیکھا۔ ''یہ کام کب سے کب تک کرتے ہو؟''

''صبح سے لے کر شام تک، جب تک لوگ یہاں موجود رہتے ہیں صاحب!''

صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس میں سکے کھنکھنانے کی آواز آئی۔ انہوں نے فوراً وہ ہاتھ نکال کر دوسری جیب میں ڈال دیا۔ اس جیب میں سے کڑکڑاتے نوٹ نکلے۔

''ہمیں یوں نقدی ساتھ لیے پھرنے کی عادت نہیں۔'' وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔ ''بہرحال یہ حاضر ہے۔ اگر تمہاری کچھ مدد کر سکیں۔''

دال بیچنے والے کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ہزار ہزار کے کئی نوٹ تھے۔ صفدر نے خشک حلق تھوک نگل کر تر کیا۔

''اوہ میرے خدا! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ ایسی فیاضی۔'' اس کا دل وہ الفاظ ترتیب دینے لگا جن سے اسے اپنی غربت کا حال اس شخص کے سامنے بیان کرنا تھا۔

''خدا آپ کو خوش رکھے صاحب! آپ کا بال بچہ سلامت رہے۔ خدا آپ کو اتنا دے کہ آپ سمیٹو اور وہ اور بھی زیادہ ہو جائے۔'' دال والے نے اس فیاضی کو دیکھ کر ڈھیروں دعائیں دینا شروع کر دیں۔'' اس بے انصاف دنیا میں صاحب! اس خود غرض دنیا میں آپ ایسے فیاض اور بڑے دل والے لوگ بھی ہیں، صاحب! آپ جیسے لوگوں کے دم قدم سے دنیا آباد ہے۔ خدا آپ کو آباد رکھے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''یہ قلعہ دیکھ رہے ہو؟'' صاحب نے اپنے چہار طرف نظر دوڑائی اور بے بسی سے مسکرائے۔ ''ہے کوئی عبرت پکڑنے والا تو اس عظیم الشان مسکن کو دیکھے جہاں راج پاٹ والے بستے تھے۔ آج یہ ویرانہ بنا پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ کسی چیز کو ثبات نہیں۔ ہر شے تغیر کی زد میں ہے سب کے سب، پھر آبادی کی دعائیں کیسی پھر مال کی خواہش کیسی سب ٹھاٹھ پڑا رہ جاتا ہے، جب لاد چلتا ہے بنجارہ۔''

''یہ دیوان عام خرم نے تعمیر کروایا۔'' اب خاتون نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ جھروکہ ظل الٰہی کی یادگار ہے۔ کبھی یہ جگہیں بادشاہوں، شہزادوں، شہزادیوں اور ان کی رعایا سے آباد رہتی ہوں گی۔ شان و شوکت اور عظیم المرتبتی کا نشان دیتی ہوں گی مگر اب کیا ہے یہ؟'' اس نے ہاتھ بڑھا کر مٹھی بھر مٹی نیچے سے اٹھالی۔

''سب خاک، سب خاک۔''

صفدر اور دال والا دونوں سر جھکائے یہ عبرت آمیز گفتگو سن رہے تھے۔ یہ شہر بہت پھیل گیا ہے۔ راوی کا کنارہ جو اس قلعہ کی فصیلوں کو چھوتا تھا۔ سمٹ کر نجانے کہاں جا لگا ہے۔ سب راستے گندمڈ ہو گئے ہیں۔ انسانوں کا ایک ہجوم بیکراں جو راستوں پر رواں دواں ہے۔ یہ قلعہ اور اس جیسی کئی اور عمارتیں ماضی کے مطالعہ کا ذریعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ یہ سب تغیر کا ثبوت ہے، تغیر کا۔'' صاحب نے کہا۔

''آپ کو یہاں آ کر مایوسی ہوئی صاحب! ہمیں افسوس ہے۔ شاید ہم اس قیمتی ورثے کو ٹھیک سے سنبھال نہ سکے۔'' صفدر نے دل گرفتگی کی کیفیت میں اعتراف کیا۔

''یہاں ہمیشہ ایسے نہیں رہتا صاحب!'' دال والے کو اچانک کچھ یاد آیا۔ ''جب باہر کے ملک سے کوئی بڑا مہمان آتا ہے، اس وقت یہاں بڑی روشنیاں ہوتی ہیں، قلعے کو سجایا جاتا ہے، بڑی دعوتیں ہوتی ہیں اور پھر یہاں ادھر اس شیش محل کے سامنے کئی مرتبہ اسٹیج لگا کر ڈرامے بھی کئے جاتے ہیں جی، اس وقت بڑی رونق ہوتی ہے، بڑے لوگ آتے ہیں یہاں ان فلکشوں (فنکشنوں) پر۔ کیوں بھائی! میں کوئی غلط کہہ رہا ہوں؟''

اس نے صفدر سے تائید چاہی۔ صفدر نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے صاحب کو دیکھا جس کا سر جھکا ہوا تھا۔ اسے دلی افسوس ہوا، یہ بیچارہ نجانے کہاں سے دل میں میں خیال لے کر آیا ہو گا کہ

پاکستان کے شہر لاہور کی تاریخی عمارتیں دیکھے گا مگر ہے تو یہ بھی ٹھیک کہ ان عمارتوں کو ٹھیک طرح سے ریسٹور بھی تو نہیں کیا گیا جبکہ وہاں جہاں سے یہ آیا ہے، تاریخی ورثے کو جان سے لگا کر رکھا جاتا ہے۔

''ادھر انڈیا والے بھی کسی چیز کو سنبھال کر نہیں رکھتے صاحب! ان کے پاس تو ہم سے بھی زیادہ ایسی چیزیں ہیں، سب خراب ہو گئی ہیں۔ لال قلعہ، تاج محل اور نجانے کیا کیا سر! سب پیسہ کمانے کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں مگر ختم ہو رہے ہیں۔'' اس نے اپنے دفاع میں ایک بودی سی دلیل دینے کی کوشش کی۔

''ابھی تم نے بتایا تھا کہ تم لوگوں نے یہ ملک اس لیے بنایا کہ تمہاری تاریخ، ثقافت اور سب سے بڑھ کر مذہب مختلف تھے۔'' صاحب نے جتلانے والے انداز میں کہا۔

صفدر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

''مگر ثقافت کی تزئین و سجاوٹ محض بیرون ملک سے آئے مہمانوں کو خوش رکھنے کے لیے کرتے ہو۔'' وہ پھر بولے۔ صفدر نے سر جھکا لیا۔

''اچھا چلو راوی دکھلا لاؤ۔ ہم بھی دیکھیں، کیسا سمٹا وہ بپھرا دریا۔'' پھر انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ یہ بات شاید انہوں نے صفدر کی شرمندگی مٹانے کو کہی تھی۔

''ہم تو بری طرح تھک گئے۔'' خاتون بولیں۔ ''ہمیں ایسی مشقت کی عادت نہیں۔''

''مت بھولئے بیگم صاحبہ! آپ کے پاس صرف ایک دن ہے، صرف ایک دن۔'' صاحب نے یاد دلایا۔

''اوہ ہاں۔'' انہیں یاد آ گیا۔ ''یہاں شاہی حرم سرا کے تو آثار بھی نظر نہیں آ رہے۔''

''بس یہ ہی دیکھنے کو تو ہمیں یہاں آنے کا حکم ہوا تھا۔'' صاحب نے دکھ کے ساتھ کہا اور اٹھ کر چل دیئے۔ صفدر، دال والا اور خاتون ان کے پیچھے چلے۔ جلد ہی خاتون نے صاحب کو پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ تیز مگر بہت باوقار انداز میں قدم اٹھا رہی تھیں۔

''صاحب! آپ ٹھنڈا پیو گے۔ کیا پیو گے سیون اپ، کوکا کولا، پیپسی، سپرائٹ، مرنڈا۔'' قلعہ کے گیٹ سے باہر نکل کر دال والے نے عاجزی سے کہا۔

''کچھ نہیں۔ ہم یہاں کھانے پینے کے لیے نہیں آئے۔'' مرد نے وضع دار انداز میں کہا۔ محمد صفدر گاڑی نکال کر لانے کے لیے بڑھا۔ اس کی گاڑی کی حفاظت پر مامور محلے دار ایمان داری سے گاڑی سے جڑا بیٹھا تھا۔

''کیا ٹھاٹھ ہیں بھائی صفدر! ایسی عالی شان گاڑیوں پر ایسے بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ گھومتے ہو۔ تمہارے تو عیش ہیں بھیا!'' محلے دار مجید نے کہا۔

''بس آج کا دن خیریت سے گزر جائے، دعا کرو بھائی مجید! آج کا دن بڑا سخت ہے۔'' صفدر نے

گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ صاحب اور بیگم کے چہروں سے تھکن ہویدا تھی۔ بیگم صاحب نے مسلسل ناک پر خوشبو میں بھیگا رومال رکھا ہوا تھا۔ صفدر نے گاڑی ان کے قریب لا کھڑی کی۔ اب وہ دریائے راوی کی طرف رواں تھے۔ صفدر دل ہی دل میں ڈر رہا تھا۔ اب نجانے دریائے راوی کو دیکھ کر انہیں کتنی مایوسی ہوگی۔ یہ دونوں لگتا ہے پچیس تیس برس بعد پاکستان آئے ہیں یا پھر شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ کے بعد۔

''لیجئے سر! راوی کا دریا آ گیا۔'' صفدر نے دریائے راوی کے قریب پہنچ کر کہا۔

''نہیں۔'' صاحب بے اختیار بول اٹھے۔ ''یہ دریائے راوی نہیں ہو سکتا۔''

''یقین کر لیجئے سر! یہ ہی راوی ہے۔ میں نے آپ سے کہا تھا نا کہ راوی اب بالکل سکڑ کر مختصر ہو گیا ہے۔''

''اوہ خدا۔'' صاحب نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ''یہ تم لوگوں نے چیزوں، راستوں، عمارتوں اور ثقافت و مذہب کے ساتھ کیا کیا ہے۔ یہ وہ جگہیں تو نہیں، جنہیں دیکھنے ہم یہاں آئے تھے۔ یہ وہ راستے نہیں، یہ وہ عمارتیں نہیں۔''

''سر! گزرتے وقت کے ساتھ انسانوں نے ترقی کی منزلیں طے کی ہیں۔ انسان کی سوچ نے ترقی کی ہے۔ اس کے رہن سہن نے، اس کے علم نے، اس کی زبان و ثقافت نے۔ آپ نے جدید لاہور کے اسکائی اسکریپرز نہیں دیکھے۔ ملٹی نیشنل کمپنیوں کے فرنچائز اور سرمایہ کاری نہیں دیکھی۔ آپ نے ترقی کے سارے نشان دیکھے بغیر یہ کہہ دیا کہ آپ کو قدیم لاہور دیکھنا ہے۔ قدیم تو قدیم ہی ہوتا ہے نا سر! پرانا اور بوسیدہ اس کی جتنی بھی دیکھ بھال کرو، وہ نیا تو نہیں رہ سکتا۔'' صفدر کو صاحب کے اس افسردہ مزاج نے چڑا دیا تھا اور وہ بول اٹھا۔

''تمہارا کیا خیال ہے۔ پچھلے انسانوں نے ترقی نہیں کی تھی۔ یہ جو عمارتیں آج بھی کھڑی ہیں، اپنی بنیادوں پر صدیاں گزر جانے کے بعد بھی تو تمہارا کیا خیال ہے کہ کھیل کھیل میں بن گئی تھیں یہ سب چیزیں۔'' بیگم صاحبہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''یہ مان لو کہ تم لوگوں نے ترقی کی منزلیں طے کرتے کرتے وضع داری اور خودداری کے سارے سبق بھلا دیئے۔''

''ہم لوگ۔'' محمد صفدر نے اسٹیئرنگ گھماتے ہوئے سوچا۔ ''چہ خوب۔ ہم لوگ اور آپ لوگ کون ہیں، اسی دنیا کے باسی۔ گو ذرا پرانے ہو گئے ہیں مگر دنیا پر جو گزری، وہ آپ لوگوں نے بھی تو دیکھی۔'' اس نے بے ارادہ ہی ریڈیو کا بٹن آن کر دیا۔

''اتحادی فوجوں کے بمبار طیاروں کی بغداد اور فلوجہ پر بمباری کے نتیجے میں سینکڑوں بچے، عورتیں اور مرد شہری ہلاک و زخمی ہو گئے۔'' نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟'' صاحب نے پوچھا۔

''وہی سر! عراق کی جنگ کی خبریں سنا رہا ہے۔ روزانہ سینکڑوں بے گناہ شہری مر جاتے ہیں۔'' صفدر

نے بتاتے ہوئے بیک ویو مرر پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ صاحب کے چہرے پر پھر وہی تلخ مسکراہٹ ابھری۔

''ابھی کچھ دیر پہلے تم بادشاہوں کے ظلم کی داستان سنا رہے تھے۔ وہ تلوار کی جنگ تھی۔ ایک وار میں ایک آدمی مرتا تھا۔ تمہارا ترقی یافتہ انسان ایک ہلے میں ہزاروں مارتا ہے۔ وہ بھی باغی یا دشمن نہیں، بے گناہ لوگ۔''

صفدر نے اپنے دل میں عجیب سی شرمندگی محسوس کی۔ وہ غلط نہیں کہہ رہے تھے۔ ''کامران کی بارہ دری دیکھیں گے سر؟'' اس نے شرمندگی مٹانے کو کہا۔

''کامران کی بارہ دری!'' صاحب نے زیر لب دُہرایا۔ ''کیا اب تک باقی ہے؟''

''کیوں نہیں سر! اس کی تو زبردست رینوویشن کروائی گئی ہے۔ آپ دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔'' صفدر نے خوش ہوتے ہوئے اندر جانے کے لیے گاڑی موڑی۔ خشک دریا خاک اڑا رہا تھا۔ اس کے کنارے بندھی کشتیوں کے روغن بھی اڑے ہوئے تھے۔ کامران کی بارہ دری سیر کے لیے آنے والے کچھ لوگ موجود تھے۔ یہاں پہنچ کر ایک بار پھر صاحب اور بیگم صاحبہ ذرا دیر کو تازہ دم نظر آئے۔

''تاریخ بتاتی ہے کہ خسرو کی بغاوت کچلنے کے لیے بادشاہ جہانگیر جب لاہور آیا تو اس نے یہاں اس بارہ دری میں ہی قیام کیا تھا۔'' صفدر نے گائیڈ کا روپ دھارا۔

''وہ باغ کامران تھا، اس مختصر بارہ دری میں اتنا لاؤ لشکر کہاں سماتا۔'' صاحب نے پرسکون لہجے میں کہا۔ یہاں آ کر ان کے چہرے پر سرور سا نظر آ رہا تھا۔

''باغ تو سنا ہے بادشاہوں نے بہت بنوا رکھے تھے۔ سر! اس شہر میں آج سوائے شالامار باغ کے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ دریا راوی نے اپنے راستے بدلے اور بہت کچھ غرق آب ہوا۔''

''ترقی کرنے والے انسان نے باغ اجاڑ کر کالونیاں جو بنالیں۔'' خاتون نے طنزاً کہا۔

''آپ یہاں سیر کی غرض سے آئے ہیں؟'' صاحب نے موجود ایک بزرگوار سے پوچھا جو سیڑھیوں پر بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے۔

''ہم یہاں قریب کے ہی رہنے والے صاحب! میں تو اکثر ہی یہاں آ جاتا ہوں، بڑا سکون ہے یہاں۔'' بزرگوار نے کہا۔

''کیسی گزر رہی ہے؟'' صاحب نے ایک اور مختصر سوال کیا۔

''اپنی تو کٹ گئی صاحب! بچوں کی زندگیوں کی طرف سے فکرمند رہتے ہیں۔ برسہا برس سے یہاں رہتے آ رہے ہیں۔ رہائش بھی یہیں بنائی مگر اب یہ علاقہ ڈاکوؤں، چوروں کی آماجگاہ بن گئی ہے۔ سرِشام ناکے لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ زندگی مشکل ترین ہو گئی ہے۔''

''ڈاکو ناکے لگاتے ہیں تو حکومتِ وقت کیا کر رہی ہے۔'' صاحب نے رعب دار آواز میں کہا۔

''حکومت کا کیا جاتا ہے صاحب! لٹتا تو عام آدمی ہے نا۔''

''حکومت وقت نے کوئی انتظام نہیں کر رکھا لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کے لیے؟''

''جن کو اس کام پر مامور کر رکھا ہے، وہ خود لٹیروں کے سرپرست ہیں صاحب! باقاعدہ حصہ لیتے ہیں لوٹے ہوئے مال سے۔'' بزرگوار نے کہا۔ صاحب نے تمسخر اڑاتی نظروں سے صفدر کی طرف دیکھا۔

''غیر ترقی یافتہ بادشاہ زمین کے ایک مختصر ٹکڑے کے حاکم نہیں تھے۔ ان کی سلطنت کہاں سے کہاں تک پھیلی تھی جانتے ہو؟'' انہوں نے صفدر کو مخاطب کیا۔ صفدر نے سر جھکا لیا۔

''مگر ڈاکو لٹیرے، چور، رشوت کھانے والے، بے انصافی کرنے والے قاضی، آنکھیں بند رکھنے والے حاکم علاقہ کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہ ملتے تھے کیونکہ ایسے جرائم کی سزا اتنی سخت تھی کہ کوئی ان میں ملوث ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''ان کی تو کیا بات تھی جناب! بادشاہوں کی جی، ان کے زمانے میں تو راوی ہر طرف چین ہی چین لکھتا تھا۔'' بزرگ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''آج بھی اس دنیا کے رنگوں سے گھبرا جاتا ہوں تو یہاں آجاتا ہوں۔ بڑا سکون ملتا ہے یہاں صاحب! یونہی تو اتنی صدیاں گزر جانے کے بعد ان کے نام اور ان کے کام زندہ نہیں۔''

''مگر آپ لوگ تو صرف ان کے معاشقے، شادیاں اور عیش پرستی کے افسانوں کو ہی یاد رکھتے ہیں۔ ان پر تمثیلیں لکھتے اور نوٹنکیاں سجاتے ہیں۔'' خاتون پھنکاریں۔

''بدقسمتی ہے ہماری صاحب! بدقسمتی کی انتہا۔'' بزرگ نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اب یہی دیکھیے۔'' انہوں نے اخبار کھول کر ان سب کی نظروں کے سامنے کیا۔ ''لکھا ہے۔ جشن بہاراں منانے کے لیے ہندوستان سے ایک ثقافتی اور ایک سیاست دانوں پر مشتمل وفد یہاں آئے گا۔ دوستی ٹرین بھی چلے گی۔ ہمارے دانشور اور ہمارے بڑے بزرگ کہتے ہیں۔ سرحدوں پر برف پگھل رہی ہے۔ ہندو ثقافت کی بھرپور عکاسی کرنے والے ڈرامے اور فلمیں ہماری نوجوان نسل دن رات ٹی وی پر دیکھتی ہے اور کہتی ہے کہ کتنی کلرفل زندگی ہے ان لوگوں کی جبکہ ہمارا مذہب تو بہت ڈل اور بور ہے۔ نہ کوئی رنگ ہے اس میں نہ تماشا۔''

بزرگوار صورتحال کو سمجھے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کیے جا رہے تھے۔ محمد صفدر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

''بیرون ملک سے آنے والے مہمانوں کے سامنے اپنی خامیاں کون بیان کرتا ہے مگر یہ جاہل بوڑھا کیا جانے۔'' اس نے سوچا۔

''اور سنا ہے کہ یہ نیا ملک نظریاتی اور ثقافتی بنیادوں پر بنا تھا۔'' صاحب نے ایک اچٹتی نظر صفدر پر ڈالتے ہوئے کہا۔

''بنا تو ایسے ہی تھا صاحب! مگر ہم سے ان افکار کی حفاظت نہ ہو سکی۔ نہ نظریے کی، نہ ثقافت کی۔'' بزرگ نے کہا۔

''بس بہت سیر ہو چکی۔ میرا خیال ہے کہ اب ہم واپس چلیں۔'' خاتون نے یہ سب سن کر نخوت سے کہا۔

''ابھی چند گھنٹے باقی ہیں واپسی میں۔'' صاحب نے یاد دلایا۔

''شالامار باغ نہیں دیکھیں گے صاحب!'' صفدر کو اگرچہ اپنا روٹ خراب ہونے پر افسوس تھا مگر وہ ان دونوں پر کچھ اچھا تاثر ڈالنا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ان کی سیر کچھ اتنی اچھی نہیں رہی تھی۔ ''اور صاحب! آپ نے صبح سے کچھ کھایا بھی نہیں۔ آپ کھانا کھائیں گے؟''

''نہیں، ہمیں اشتہا نہیں۔'' صاحب نے کہا۔ ''مگر تمہیں تو بھوک لگ رہی ہوگی۔''

''نہیں صاحب! میں اچھا ناشتہ کر کے آیا تھا۔'' صفدر نے ٹوپی سر پر جماتے ہوئے کہا۔

''پھر اگر کہیں وہ پرانا شہر موجود ہے تو ایک نظر دکھا دو۔'' صاحب نے کہا اور بزرگوار سے ہاتھ ملایا۔ صفدر نے دیکھا۔ صاحب کی انگلی میں قیمتی پتھر سے مزین انگوٹھی تھی۔

اس کے بعد وہ انہیں لیے اندرون شہر گھومنے کی کوشش کرتا رہا۔ موچی دروازہ، بھاٹی دروازہ، لوہاری دروازہ، دہلی دروازہ، مغل پورہ، شالامار باغ۔ اب وہ محض ایک نظر ہی ڈال رہے تھے سب جگہوں پر۔ ''جلدی جلدی، دیر ہو رہی ہے۔ وقت گزر رہا ہے۔'' وہ ساتھ ساتھ کہے جا رہے تھے۔

''افوہ! میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔ میرا سر درد سے پھٹا جا رہا ہے۔ اتنی آبادی اور اتنی گھٹن۔ اب میں واپس جانا چاہتی ہوں۔'' شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ جب خاتون نے چلانا شروع کیا

''ہاں، اب تو وقت بھی تقریباً ختم ہو چکا۔'' صاحب نے سرد آہ بھر کر کہا۔

''آپ کہاں جائیں گے سر! یہاں کسی رشتہ دار کے پاس، کسی ہوٹل میں یا ائیر پورٹ؟'' صفدر نے کہا۔

''ہمیں لاہور سے ذرا باہر نکل کر شاہدرہ چھوڑ آؤ۔'' صاحب نے ایک حیرا، کن جواب دیا۔

''شاہدرہ۔'' صفدر حیران ہوا۔ ''لونجی، ان کے رشتہ دار شاہدرہ رہ رہے ہیں اور ٹھاٹھ کتنے ہیں۔''

''جی سر!'' اس نے سر جھکا کر کہا اور گاڑی لاہور سے باہر نکلنے والی سڑک پر ڈال دی۔

''آپ مجھے آٹوگراف دیں گے سر! میں اپنے ساتھ آنے والے ہر مہمان سے آٹوگراف ضرور لیتا ہوں سر!'' صفدر نے جیب سے ایک چھوٹی سی ڈائری نکالتے ہوئے کہا۔

''لاؤ۔'' کچھ دیر سوچنے کے بعد صاحب کی آواز آئی۔ صفدر نے ڈائری پیچھے پکڑا دی۔

''قلم۔'' پیچھے سے آواز آئی۔ صفدر نے بال پوائنٹ بھی پکڑا دیا۔ واپسی کا سفر خاموشی میں کٹا۔ کیسے مہمان ہیں، کچھ کھایا پیا تک نہیں۔ سارا دن بھوکے پھرتے رہے۔ نجانے انہیں کس چیز کی تلاش تھی۔ سر پھرے لگتے ہیں۔ سینائیل جو اس عمر میں اکثر لوگ ہو جاتے ہیں، صفدر اس سفر کے دوران مسلسل اوٹ پٹانگ باتیں

سوچتا رہا۔ شاہدرہ پہنچنے تک اندھیرا ہر سو چھا گیا تھا اور فضا میں دھند پھیل رہی تھی۔

''کس سمت جانا ہے صاحب؟'' شاہدرہ پہنچ کر گاڑی کے خاموش ماحول میں صفدر کی آواز ابھری۔

''آئی ایم سوری سر! میں اس جگہ سے ناواقف ہوں۔ آپ مجھے گائیڈ کر دیں گے؟''

صفدر نے کہا۔ عقب سے کوئی آواز نہیں آئی۔ صفدر نے اپنی بات دہرائی۔ عقب میں اب بھی خاموشی تھی۔ صفدر نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پچھلی نشستیں خالی تھیں۔

''اوہ میرے خدا!'' اس نے گاڑی سڑک کے کنارے روک کر پیچھے دیکھا۔ پیچھے اب بھی کوئی نہ تھا۔ اس نے گاڑی کی لائٹس جلائیں۔ صاحب و خاتون کے وجود سے اٹھتی خوشبو اور پچھلی نشست پر رکھی اس کی ڈائری اور بال پوائنٹ کے سوا پیچھے کچھ بھی موجود نہ تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈائری اٹھالی۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ ڈائری کے نیچے نیلے، سبز کڑکڑاتے نوٹوں کا ایک مختصر سا ڈھیر رکھا تھا۔ صفدر کے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ڈائری کھولی۔

''انسان، عہد اور زندگیاں ختم ہو جاتی ہیں مگر واقعات، کارنامے اور پشیمانیاں باقی رہ جاتی ہیں۔ اپنے مسکن لاہور کو دیکھنے کی خواہش پر ایک مختصر وقت عطا ہوا مگر اسے ایک نظر دیکھنے کی خواہش کی پشیمانی تا قیامت رہے گی۔ درست ہے کہ انسان اپنے اپنے وقتوں اور ادوار میں ہی سمجھتے ہیں مگر ایک بات یاد رکھو کہ نظریات اور رسوم و رواج و ثقافت کی حفاظت نہ کر سکنے والی قومیں کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لیں۔ تاریخ کے صفحات پر جگہ پانے میں ناکام رہتی ہیں۔ سو ترقی کر لینے کی رٹ چھوڑو اور اس کے لیے ٹرینڈز کو فالو کرنے کا سودا بھی، اور اپنی تاریخ سے پوچھو کہ نظریات کی حفاظت اور ترقی ساتھ ساتھ کیسے جاری رکھی جا سکتی ہے۔'' تاریخ'' جس میں عشق و عاشقی کی داستانوں کے علاوہ بھی عبرت حاصل کرنے کو اور سیکھنے کو بہت کچھ موجود ہے۔ ایک مختصر زادِ راہ بھی عنایت ہوا تھا جو بچ رہا تمہارے حوالے شاید تمہارے کچھ کام آ سکے۔''

مختصر تحریر کے نیچے دستخط بھی ثبت تھے۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے صفدر نے آنکھوں کے قریب ڈائری لاتے ہوئے دستخط دیکھے۔

سلیم اکبر المعروف نور الدین جہانگیر

مہر النسا المعروف نور جہاں

اس کی نظروں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور ڈائری اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی۔

☆

محمد صفدر شاہدرہ سے واپس کمپنی آفس میں کیسے پہنچا اسے پتہ نہیں چلا۔ کمپنی کے آفس میں آ کر ریکارڈ کلرک سے ان دونوں مہمانوں کے کوائف پوچھنے پر اسے پتہ چلا تھا کہ ان دونوں نے اپنے پاسپورٹ

قونصلیٹ میں ویزا ایکسٹینشن کی درخواست کے ساتھ جمع ہونے کی وجہ سے فارمل پیپرز کمپنی آفس میں جمع کروائے تھے اور حیرت انگیز طور پر وہ پیپرز ریکارڈ فائل سے غائب ہو چکے تھے۔ گاڑی کی عقبی نشست سے محمد صفدر کو جو نقدی ملی تھی۔ وہ تقریباً ایک لاکھ روپے کے برابر تھی۔ اس کے علاوہ محمد صفدر کو اس جگہ سے جہاں وہ خاتون بیٹھی تھیں۔ ایک سکہ اور ایک انگوٹھی بھی ملی تھی۔ سکہ پر بہ زبانِ فارسی بیگم نور جہاں کے الفاظ کندہ تھے اور انگوٹھی غالباً شاہی مہر تھی۔ محمد صفدر نے خوف کے مارے یہ دونوں چیزیں کسی کو نہیں دکھائی تھیں مگر سنا ہے کہ محمد صفدر تقریباً ایک ماہ تک گردن توڑ بخار میں مبتلا رہا جس کے دوران وہ ہذیان بکتا رہا۔ وہ کسی بادشاہ اور ملکہ کو پکار کر اپنی گستاخیوں کی معافی طلب کرتا تھا اور ساتھ میں پکار پکار کر کہتا تھا۔

''آپ حق پر ہیں صاحب! آپ حق پر ہیں۔''

نوٹ: معزز قارئین! آٹو گراف ایک افسانہ ہے، محض تخیلاتی پرواز کی تحریری شکل۔ صرف ماضی اور حال کا موازنہ اور تاریخ سے مختصر واقفیت بذریعہ اس ریویو کے مقصود ہے۔

حرفِ سادہ کو عنایت ہوا اعجاز کا رنگ

وہ شام کا نجانے کون سا وقت تھا۔ جب اچانک گہری نیند سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اسے فوری طور پر یاد نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے نیم تاریکی میں ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ بیڈ سائیڈ ٹیبل پر اسے ٹیبل لیمپ کا ہیولہ نظر آیا۔ اس نے ٹٹولنے کے سے انداز میں لیمپ کا تار اور سوئچ ڈھونڈا۔ سوئچ ہاتھ میں آنے پر اس نے اسے دبا دیا۔ کمرے میں روشنی پھیل گئی اگرچہ یہ شیڈڈ روشنی سب چیزوں کو واضح نہیں کر رہی تھی مگر اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔ یہ یاد آنے پر کہ وہ کہاں ہے۔ اس نے ادھر اُدھر نظریں گھما کر کسی دوسرے ذی روح کو تلاشا، اسے محسوس ہوا کہ اس وقت وہ کمرے میں تنہا ہے۔

اس نے گہرا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔ کچھ دیر یوں ہی پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بیڈ سے نیچے ٹانگیں لٹکا کر اس نے اپنے ذہن کو پوری طرح جگانے کی کوشش کی اور پھر آہستہ قدموں سے چلتے ہوئے کمرے سے باہر آ گیا۔ ساتھ کا کمرہ بیک وقت، ڈائننگ روم اور ٹی وی لاؤنج کا کام دیتا تھا۔ یہاں اس وقت زیرو پاور کا بلب آن تھا۔ جس کی نیم روشنی میں کچھ بھی واضح نظر نہیں آ رہا تھا۔ اسے اپنے حلق میں کانٹے چبھتے محسوس ہوئے۔ اس نے دائیں ہاتھ چلتے ہوئے کچن میں جا کر فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور بوتل سے ہی منہ لگا کر پانی کے گھونٹ بھرتا دوبارہ اس کمرے میں واپس آیا، جہاں زیرو پاور کا بلب روشن تھا۔

وہ ٹی وی لاؤنج کم ڈرائنگ روم والے حصے میں جا کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں اس نیم روشنی سے مانوس ہونے لگیں۔ اس نے نیچے کارپٹ پر بیٹھے وجود کو دیکھا۔ وہ جائے نماز بچھائے سجدے کی حالت میں تھی۔ وہ اسے نماز پڑھتے دیکھنے لگا۔ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کسی کو نماز پڑھتے ہوئے اتنے غور سے دیکھا تھا۔ اس کے اپنے گھر میں نماز پڑھنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ نماز پڑھنے والے لوگ اس نے شاید ٹی وی پر، سڑک سے گزرتے ہوئے، کسی مسجد کے باہر تک صف آراء نمازیوں کی شکل میں دیکھے تھے۔ مگر ان

نمازیوں پر ہمیشہ اس نے سرسری نظر ہی ڈالی تھی۔ اس روز وہ پہلی مرتبہ کسی کو مکمل نماز پڑھتے دیکھ رہا تھا۔ یہ سارا عمل اسے اٹھنے بیٹھنے اور جھکنے کا سا لگا کرتا تھا، مگر اس عمل میں وہ کون سی بات تھی جو اس عمل کو کرنے والے کو اردگرد سے بے نیاز اور غافل کر دیتی تھی۔ یہ اس نے اس روز پہلی مرتبہ سوچا تھا۔ پھر اس نے دائیں بائیں دیکھا سلام پھیرا اور محو دعا ہوئی۔

وہ بچوں کی سی دلچسپی اور تجسس کے ساتھ اسے دعا مانگتے دیکھ رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی، اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ کس کے لیے اور کیا دعا کر رہی تھی۔ اس نے سوچا خود اس کے لیے وہ اپنے خدا سے کیا کہہ رہی ہوگی۔ یقیناً وہ اسے بددعائیں دے رہی ہوگی۔ اللہ سے اس کی شکایت کر رہی ہوگی، وہ اس کے سوا اس کے لیے کر بھی کیا سکتی تھی۔ وہ یقیناً خدا کے سامنے اس کا نام لے کر اسے کوس رہی ہوگی۔ اس کی تباہی اور بربادی کی دعا کر رہی ہوگی۔ وہ سعد ابراہیم جس نے جہاں افروز حکیم کی زندگی تباہ کر دی تھی۔ اس کے پیارے، اس کا گھر، اس کی تعلیم، اس کا مستقبل، اس کے خواب، اس کی سوچ، اس کی خوشیاں چھین لی تھیں۔ وہ اس کے لیے بددعا کرنے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ وہ اپنی دعا یا بددعا میں اتنی محو تھی کہ اسے ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ وہ بیڈ روم سے اٹھ کر ادھر آ چکا تھا۔ دعا کے بعد چہرہ خشک کرتے ہوئے اس نے جائے نماز کا کونا الٹا کر یونہی پیچھے دیکھا اور چونک گئی۔ وہ ہاتھ میں پانی کی بوتل پکڑے صوفے پر بیٹھا ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ افروز نے اس سارے عرصے میں پہلی بار سعد کو اپنی طرف محویت سے دیکھتے پایا تھا۔

☆

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔''

اس نے اپنے سامنے کھڑی لڑکی کو کہتے سنا تھا وہ اسی سے مخاطب تھی۔ وہ انٹر ڈویژن ٹینس ٹورنامنٹ کا سیمی فائنل جیت کر فارغ ہوا تھا اور اپنی گاڑی کی طرف جا رہا تھا، جب اس لڑکی نے اس کا راستہ روکا تھا۔ اس نے یاد کیا اس نے اس لڑکی کو پہلے بھی دیکھا ہوا تھا مگر اسے اس کا نام یاد نہیں تھا غالباً اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ اس نے اسے اس سے پہلے کہاں دیکھا تھا۔

''میں معذرت خواہ ہوں، میں جلدی میں ہوں اس وقت میں آپ کی بات نہیں سن سکتا۔'' اس نے اپنے ٹینس ریکٹ کو کور میں بند کرتے ہوئے عجلت میں کہا اور آگے چل دیا۔

''بات سنو تم!'' وہ اس کے پیچھے بھاگی اور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی ''مجھے معلوم ہے کہ تم بہت مصروف آدمی ہو اور یہ بھی کہ تم انتہائی بددماغ شخص واقع ہوئے ہو، مگر تمہیں میری بات سننا ہوگی۔'' اس کے لہجے میں حاکمیت اور درشتی تھی، وہ لہجہ بھر کو ٹھٹکا تھا۔

''دیکھیے، یوں زبردستی تو آپ مجھے اپنی بات سنا نہیں سکتیں۔'' اس نے اپنے مزاج کے خلاف انتہائی تحمل اور نرمی سے جواب دیا ''میں نے آپ کو بتایا ہے کہ اس وقت میرے پاس آپ کی بات سننے کا ٹائم نہیں

ہے، مجھے ایک انتہائی اہم فنکشن میں جانا ہے۔''

''جہنم میں جائے تمہاری مصروفیت اور تم، تمہارا فنکشن اور تمہاری سلیبریشنز۔'' وہ چیخ کر بولی۔ میں نے کہا نا کہ تمہیں میری بات سننا ہوگی آج اور ابھی۔''

اس نے اس کی اس بات پر بھی یوں سر ہلایا جیسے کسی سر پھرے پاگل سے ٹکرا گیا ہو اور راستہ بدل کر پارکنگ کی طرف مڑ گیا تھا۔ اب اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز نہیں آئی تھی۔

''جان چھوٹی۔'' اس نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے سوچا۔ ''نجانے کون احمق، توجہ کی طالب سر پھری لڑکی تھی۔''

گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے اس نے ادھر ادھر نظریں گھمائیں اس کے دوست، اس کے سپورٹر اس سے ایک بڑی ٹریٹ لینے کا وعدے لے کر بکھر چکے تھے، اب وہ سب اس کو ایک بڑے ہوٹل کے ریستوران میں ملنے والے تھے۔ اس نے جیت کی خوشی میں ایک مشہور انگلش گانے کی دھن پر سیٹی بجاتے ہوئے ریکٹ کور کو پچھلی سیٹ پر پھینکا، اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی سٹارٹ ہوتے ہی اس کی ہیڈ لائٹس جل اٹھیں اور ان کی تیز روشنی میں وہی لڑکی اسے گاڑی کے سامنے کھڑی نظر آئی۔ وہ دونوں بازو پھیلائے کھڑی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں اس پر لعنت بھیجی اور دانت پیستے ہوئے ہارن بجایا۔ مگر وہ اپنی جگہ سے ہلنے کو تیار نہ تھی۔ گیٹ پر کھڑے سیکورٹی گارڈز، اندر آنے اور باہر جانے والے لوگ بھی ادھر متوجہ ہوئے۔ اس کے بار بار ہارن بجانے پر بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی۔ وہ اس پر لعنت بھیجتا دروازہ کھول کر باہر نکلا تھا۔

''کیا مسئلہ ہے آپ کا محترمہ؟'' اس نے کھلے دروازے کے ساتھ کھڑے کھڑے کہا ''شاید آپ مجھے ٹھیک طرح نہیں جانتیں، مجھ پر اس طرح کے ڈراموں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔ آپ ایک سائیڈ پر ہو جائیے اور مجھے مجبور مت کیجیے کہ میں آپ کو روندتا ہوا چلا جاؤں۔''

''اچھی طرح بہت اچھی طرح جانتی ہوں تمہیں بھی اور تمہارے مزاج کو بھی۔ تم پر کس طرح کی باتوں کا اثر ہوتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں۔ جہاں تک روندنے کا تعلق ہے تو میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم دوسروں کی روح، ذہن اور جسم روندنے کے بھی ماہر ہو۔ میں ادھر ہی کھڑی ہوں ادھر ہی کھڑی رہوں گی۔ لو روندو مجھے، بند کرو دروازہ اور چلاؤ گاڑی۔'' اس کا جواب چیلنجنگ تھا۔

وہ کچھ دیر یونہی کھڑا اسے دیکھتا رہا اور پھر شانے اچکا کر گاڑی میں بیٹھ گیا، اس نے گاڑی سٹارٹ کر کے ذرا بیک کی، اس کے دائیں بائیں دونوں طرف گاڑیاں پارک تھیں، پہلو بچا کر نکلنے کا کوئی موقع نہ تھا۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کی رفتار بہت کم تھی مگر لڑکی سے فاصلہ بھی اتنا ہی کم تھا۔ کچھ لوگ رک کر اس منظر کو ششدر نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''پلیز سر، پلیز۔'' گیٹ پر کھڑے سکیورٹی گارڈز میں سے ایک رائفل شانے پر رکھے ادھر بھاگا تھا۔ اس نے لڑکی سے ہٹنے کی درخواست کی تھی اور نہ سنے جانے پر اس کی طرف بھاگا تھا، اب وہ اس کی سیٹ کی طرف کا شیشہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ وہ تماشا بننا نہیں چاہتا تھا مگر ایک فضول سی لڑکی کے ہاتھوں بن رہا تھا۔ اس نے باآواز بلند بہ زبان انگریزی گالیاں دیتے ہوئے گاڑی کو بریک لگا دیا۔ گاڑی کے چاروں ٹائر بری طرح چرچرائے اس نے دیکھا وہ لڑکی اسی طرح تنی کھڑی تھی۔

''کیا معاملہ ہے؟'' کلب کے ایک مستقل رکن جنہیں وہ بہت اچھی طرح جانتا تھا کہیں سے نکل کر اس کے پاس آئے تھے۔

''مجھے معلوم نہیں، مگر ان محترمہ کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے۔'' اس نے سر جھٹک کر کہا۔ وہ لڑکی کی طرف چل دیئے۔ کچھ دیر اس سے بات کرنے کے بعد وہ اس کی طرف آ گئے۔

''وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے سعد! اس کی بات سن لو، دو منٹ لگیں گے۔''

وہ اس بے ہودہ لڑکی کی بات ایک سیکنڈ کے لیے بھی سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ دو منٹ کی بات کر رہے تھے۔ مگر وہ اس جگہ پر کوئی تماشا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

''میں نہیں جانتا انکل! اور نہ ہی میں سمجھتا ہوں کہ اس کو مجھ سے کوئی بات کرنا ہے، یہ محض تماشا ہے۔'' اس نے اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا تھا۔

''کم آن مائی سن! اگر وہ کہہ رہی ہے تو کچھ تو بات ہو گی، آؤ باہر اس کی بات سن لو، دیکھو یہ یوں اچھا نہیں لگ رہا۔''

ان صاحب کے درمیان میں آ جانے پر مجبوراً اسے باہر نکلنا پڑا تھا۔ وہ اس سے دو قدم آگے چل کر اس لڑکی کو ساتھ لیے ممبرز لاؤنج کی طرف چل دیئے تھے۔ وہ مرے مرے قدموں سے ان کے پیچھے چل دیا۔ ان دونوں کو ایک کافی ٹیبل پر بٹھا کر وہ دوسری طرف چلے گئے تھے۔ وہ یقیناً کسی کا تماشا نہ بنانے والوں میں سے تھے، ورنہ بات اچھالنے کا اس سے اچھا موقع لوگوں کے ہاتھ کب آنا تھا۔

''جو بات میں کرنا چاہ رہی ہوں، وہ تمہارے بھلے کی ہی تھی۔'' ان صاحب کے دوسری طرف جاتے ہوئے لڑکی نے کہا۔ وہ اسے یوں دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔ آرام سے پہلے ہی سن لیتے۔

''میں تمہیں جانتا تک نہیں ہوں، تمہارے نام تک سے واقف نہیں ہوں پھر تم میرے کس بھلے کی بات سناؤ گی مجھے، مجھے نفرت ہے توجہ حاصل کرنے کے ان اوچھے ہتھکنڈوں سے۔'' وہ اس پر برسا، شاید نہیں یقیناً وہ اپنی شخصیت کی جاذبیت سے اچھی طرح واقف تھا، اپنے حلقے میں وہ لیڈی کلر کے نام سے مشہور تھا۔

''تم یقیناً مجھے نہیں جانتے، مگر تم جہاں افروز کو تو جانتے ہو نا؟'' اس کے انتہائی غیر مہذبانہ لہجے اور

رویے کے جواب میں لڑکی نے نرمی سے کہا تھا۔

''جہاں افروز!'' سعد کے دماغ میں کچھ کلک ہوا، مگر اُسے ٹھیک سے یاد نہیں آیا۔

''کون جہاں افروز؟''

''وہی جہاں افروز، جس کی عزت سے پچھلے مہینے تم اپنے دوست کے اپارٹمنٹ پر کھیلے تھے، یقیناً تمہیں یاد آ گئی ہوگی، ہاں یہ اور بات ہے کہ تم اس کا نام ٹھیک سے جانتے ہو گے نا آگا پیچھا۔ مگر اس کی شکل تو تم نے خوب ہی اچھی طرح دیکھ لی ہوگی۔'' اس نے اپنے بیگ سے ایک پاسپورٹ سائز فوٹو نکال کر میز کی شفاف سطح پر رکھی تھی۔

''اوہ!'' اس نے ایک سرسری نظر اس تصویر پر ڈالی، اسے ایک لمحے میں بہت کچھ بہت اچھی طرح یاد آ گیا تھا۔ ''اچھا تو تمہارا تعلق بلیک میلرز کے گروہ سے ہے۔''

''بلیک میل کرتی ہے میری جوتی۔'' وہ ایک بار پھر چلائی تھی۔ اردگرد کے لوگ ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر ادھر اُدھر دیکھنے لگے تھے۔ اسے اپنی غلطی کا بری طرح احساس ہوا تو اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

''دیکھو سعد ابراہیم! وہ معاملات جو تمہاری زندگی کا معمول ہیں وہ اور ہیں یہ معاملہ کچھ اور ہے۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا اس سارے ڈرامے کا مطلب کیا ہے۔'' وہ بری طرح چڑ کر بولا تھا۔

''میں سمجھاتی ہوں۔'' اس نے نیچی آواز میں کہا۔ ''دیکھو جہاں افروز کو اس کے گھر والوں نے گھر سے نکال دیا ہے۔ وہ میری دوست ہے، تمہیں یاد ہوگا۔ اسی دوستی کے ناطے میں نے اسے اپنے گھر میں پناہ دی ہے۔ مگر میرے گھر والے مشکوک ہو چکے ہیں۔ اس کے میرے گھر قیام کا کوئی بہانہ نہیں چل رہا اب۔ اگر اس کے ماں باپ عمرے پر گئے تھے تو اب تک انہیں آ چکے ہونا چاہیے تھا، ہے نا؟'' اس نے تائید چاہی اور سعد نے بمشکل اپنی جمائی روکی۔

''یہ بات سعید سے کرو تم، مجھے کیوں تنگ کر رہی ہو تم۔'' اس رات کی ہر بات بہت اچھی طرح یاد آ جانے کے باوجود وہ تنک کر بولا تھا۔

''اس لیے کہ جہاں افروز کا ریپ سعید اکبر نے نہیں تم نے کیا تھا۔ وہ سعید اکبر کے نہیں تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔''

''یو بلنڈی بلیک میلر۔'' اس کی اس بات پر وہ ایک بار پھر اشتعال میں آ گیا ''تم کیا سمجھتی ہو، اس طرح کی باتیں سنا کر تم مجھے بلیک میل کر لو گی۔ مجھے کیا معلوم وہ کون تھی اور کس کی غلطی سے لائی گئی تھی۔ ویسے بھی سعید اکبر لڑکیوں کو لاتا نہیں وہ خود آتی ہیں۔ یہ بھی ہوگی اسی طرح کی کوئی۔''

اس نے انگلی سے میز پر دھری تصویر کی اسٹرائیک کر کے لڑکی کی طرف دھکیل دیا۔

''بکواس بند کرو اپنی۔'' اس نے اس بار غصے میں مگر نیچی آواز میں کہا۔ ''جہاں افروز کے بارے میں

ایسی بات کرتے تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ وہ کیا اور کیسی لڑکی ہے۔ خدا معلوم، اس کی کس غلطی کی سزا اسے تم جیسے مہذب درندوں کے چنگل میں پھنسا گئی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ ویگن اسٹینڈ پر اپنے روٹ کی وین مس کر دینے پر دیر ہو جانے کے خیال سے ٹیکسی لینے کی اتنی بڑی سزا ملے گی اسے۔ ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں شیطان اسے بٹھائے لے جا رہا تھا۔ ہوس کے کسی پجاری کی ہوس پوری کرنے کے لیے۔''

''میری سمجھ میں تمہاری کوئی بھی بات نہیں آ رہی ہے۔'' سعد نے بیزاری سے کہا۔ ''بہتر ہے کہ تم اس معاملے کو سعید سے ڈسکس کرو یا پھر کسی اور سے، میں بہرحال وہ شخص نہیں ہوں جس سے تمہیں یہ معاملہ ڈسکس کرنا چاہیے۔ تم میرا وقت برباد کر رہی ہو، اب مجھے جانے دو۔'' اس نے گاڑی کی چابیاں میز پر سے اٹھائیں اور کھڑا ہو گیا۔ ''اور سنو!'' اسے پھر کچھ یاد آ گیا وہ جاتے جاتے مڑا۔ ''دوبارہ اس قسم کا سین کری ایٹ کرنے کی جرأت مت کرنا، یہ آج صرف ان صاحب کی وجہ سے میں نے تمہاری بات سن لی ورنہ ایسے معاملات سے نبٹنا مجھے خوب آتا ہے۔'' وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا اور ممبرز لاؤنج میں بیٹھی عالیہ چغتائی اپنی اس کوشش میں بھرپور ناکامی پر حیران پریشان اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ اب اس کے پیچھے جا کر اسے روکنے کا کوئی جواز اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کی سوچ سے بھی زیادہ گھٹیا اور ذلیل شخص ثابت ہوا تھا۔ اسے اپنے منصوبے کی ناکامی کی امید نہیں تھی اور اپنے تئیں اس نے بڑی جرات کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ جہاں افروز کی دل سے مدد کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے اس نے اس کے گھر والوں، بہنوں، بہنوئیوں سے بھی خود بات کی تھی، مگر سب کی سرد مہری اور نفرت دیکھ کر اس کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ اس المناک واقعے کے مرکزی کردار سے رابطہ کرے، وہ بہت دنوں کی کوشش اور پوچھا کرنے کے بعد ہاتھ آیا تھا مگر یقیناً اس کے سینے میں دل نام کی کوئی چیز نہیں تھی، اس کے لیے یہ معمول کا واقعہ تھا۔

☆

''جن لوگوں کے سینوں میں دل ہوتے ہیں، جن کے کوئی جذبات ہوتے ہیں جو کسی بات کی شدت کو محسوس کر سکتے ہیں، وہ اس قسم کی حرکت کا ارتکاب نہیں کر سکتے تم نے یہ کیوں نہیں سوچا۔'' اس رات گھر واپسی پر عالیہ چغتائی نے جب شام کا قصہ جہاں افروز کو سنایا تو اس نے کہا۔

''میں تلخ حقیقتوں کو بھول جانا چاہتی ہوں۔'' عالیہ کی خاموشی پر اس نے سر صوفے کی پشت پر ٹکاتے ہوئے کہا ''میں اس مختصر عرصے میں اتنا رو چکی ہوں کہ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ شاید اب میرے آنسو ختم ہو جائیں، مگر اگلی بار جب اس بات کو سوچتی ہوں تو آنسو خود بخود میری آنکھوں سے گرنے لگتے ہیں، شاید ان سے میرا تعلق مستقل ہو گیا ہے۔ ان کے بہہ جانے پر میرا دل وقتی طور پر ہلکا ہو جاتا ہے۔ مگر یہ وقت ہی ہے جو دل کو دوبارہ سے یاد دلا دیتا ہے کہ اس کے ساتھ کیا گزر چکی ہے۔''

عالیہ نے خاموشی سے اس کی بات سنی تھی۔ اس کا ذہن الجھا ہوا تھا اور مختلف نقشے بنانے میں مصروف

تھا اب وہ کیا ایسا کرے جو جہاں افروز کا یہ مسئلہ حل ہو جائے۔ وہ لڑکی جو ان کے ڈیپارٹمنٹ کی ذہین ترین سٹوڈنٹ تھی۔ خاموش اور لیے دیئے رہنے والی۔ دو سال کے عرصے میں جس کی صرف عالیہ ہی سے دوستی ہو سکی تھی باقی لوگوں سے محض شناسائی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر خوش ہو جانے والی اور کسی کے معمولی سے دکھ پر بھی بے چین ہو جانے والی لڑکی خود کتنے بڑے حادثے سے گزری تھی اور کتنا اچانک۔ کبھی کبھی اسے خود پر بھی غصہ آتا تھا وہ کیوں اس روز بارہ بجے کے بعد کی دو کلاسز بنک کر کے گھر آ گئی تھی۔ اگر وہ اس روز اکٹھی ہوتیں تو شاید ایسا نہ ہوتا۔ اگر وہ اس روز وہاں موجود ہوتی تو شاید جہاں افروز دیر ہو جانے اور اکیلے ہونے کے خیال سے ٹیکسی میں نہ بیٹھتی۔ اگر وہ اس وقت اس کے ساتھ ہوتی تو دیر ہو جانے پر اپنے موبائل سے جہاں افروز کے گھر والوں کو دیر ہو جانے کی اطلاع دے سکتی تھی پھر شاید ان کا دل مطمئن رہتا اور افروز بے چین ہو کر ٹیکسی میں نہ بیٹھتی یہ اگر اور شاید کا وہ چہرہ تھا جس میں وہ اس روز سے الجھی ہوئی تھی جس روز اس نے افروز کے غائب ہونے کی خبر سنی تھی۔

عینی شاہدوں کے مطابق وہ ایک عام ٹیکسی میں اکیلی بیٹھی تھی اور غائب ہو گئی تھی وہ اس روز گھر واپس نہیں پہنچی تھی۔ اگلے روز دس بجے ایک آٹو رکشہ اسے گھر کے آگے اتار گیا تھا۔ اس کا چہرہ، اس کی ظاہری حالت پکار پکار کر بتا رہی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ ایسا گزر چکا ہے جس کا اس کے والدین نے تصور بھی نہ کیا ہو گا۔ عالیہ کو جہاں افروز کے والدین پر بھی حیرت ہوئی تھی، وہ اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ تھے۔ انہوں نے کیوں جاہلوں کی طرح بیٹی کو دھتکار دیا تھا۔ بدنامی، رسوائی جو بھی ہونا تھا ہو چکی تھی، اگر وہ درست طریقے سے واقعات اور حالات کو سب کے سامنے لے آتے تو کم از کم وہ لوگ جو اس انتہا سے گری ہوئی حرکت میں ملوث تھے سامنے تو آتے، وہ کسی این جی او سے رابطہ کر سکتے تھے، وہ ان بچیوں کے ماں باپ سے تو بہتر سماجی حیثیت کے مالک تھے جن کی آبروریزی اور وٹنی ہو جانے کی خبریں آئے روز اخباروں میں چھپتی رہتی تھیں۔ مگر انہوں نے ان جاہل، غریب، ان پڑھ والدین سے بھی گئے گزرے ہونے کا ثبوت دیا تھا اور بیٹی سے کچھ پوچھے بغیر ہی۔

''آج سے تم ہمارے لیے مر گئیں، ہم تمہارے لیے مر گئے'' جیسا کوئی روایتی جملہ دُہرا کر دروازے سے ہی اسے رخصت کر دیا تھا۔

''اگر اس بات کا یہ ہی انجام ہونا تھا تو آپ مجھے بتائیں کہ افروز کے اغوا ہونے کے دن، شام اور رات بھر آپ اس کے لیے کیوں پریشان اور بے چین رہے تھے۔ آپ نے پولیس، پریس ہر جگہ اطلاع کیوں دی تھی؟'' اس نے افروز کے والدین سے پوچھا تھا۔ اس بات کا جواب بھی ان کے پاس روایتی سا تھا۔

''اس وقت تک ہمیں درست بات کا اندازہ نہیں تھا، ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس کے ساتھ یہ

بھی ہوسکتا تھا۔''

''آپ کا کیا خیال تھا۔ یوں غائب ہوجانے پر وہ صحیح سلامت آپ کے پاس پہنچ جائے گی۔'' اس نے افسوس سے سر ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

''اس طرح آنے سے تو بہتر تھا کوئی اس کی لاش ہمیں دے جاتا۔ اس کا اغوا تاوان کے لیے کیا گیا ہوتا تو اور بات تھی، مگر ہم سے تو کسی نے تاوان مانگا نہ رابطہ کیا، ہم رات بھر منتظر رہے۔ شاید اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوگیا ہو ہم نے تمام بڑے ہاسپٹلز کے ایمرجنسی سینٹرز سے پتہ کیا، مردہ خانے تک چھان مارے، مگر وہ یوں اغوا کی جائے گی اور یوں واپس آئے گی یہ ہم نے ایک بار بھی نہیں سوچا تھا۔ ان کا جواب اس کے لیے حیران کن تھا۔

''حالانکہ بیٹیوں کے والدین ان کے اغواء کئے جانے یا غائب ہوجانے پر سب سے پہلے یہ ہی بات سوچتے ہیں۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا تھا۔ ''پھر جو بھی ہوا وہ ہو چکا تھا آپ اس سے کچھ پوچھتے تو سہی، آپ اس کے سنتے تو سہی۔''

''ہمارا گھر رشتہ داروں سے بھرا پڑا تھا۔ وہ رشتہ دار جن کو ٹیلی فون کر کر کے ہم افروز کے بارے میں پوچھتے پھر رہے تھے۔ ہمیں اپنی اسی برادری میں زندگی گزارنا ہے، ان ہی رشتہ داروں کے ساتھ، غیرت کا مقام تو یہ تھا کہ افروز کے بھائی اسے اسی موقع پر گولی مار دیتے، مگر پھر ہم تھانے کچہری کے چکر میں پڑ جاتے، ہاتھ بھی کچھ نہ آتا۔ ہم نے یوں ہی فرض کرلیا کہ وہ مرگئی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس واقعہ کو بھی بھول پڑ جائے گی اور سب لوگ اسے بھول جائیں گے۔''

''آپ کو علم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟'' عالیہ نے افروز کی امی کے چہرے کی بے بسی کو دیکھتے ہوئے ایک اور کوشش کی۔

''یہ اس کا مقدر ہے، اس میں اس کی اپنی غلطی ہے۔ وہ کیوں اس روز ٹیکسی میں بیٹھی اور پھر آخر وہ لوگ اسے لے گئے وہ اسے ہی کیوں لے گئے۔ کوئی وجہ تو ہوگی۔''

افروز کے والد اب اس بحث کو ختم کر دینا چاہتے تھے۔

وہ جو سوچ چکے تھے، جو کر چکے تھے اس سے واپسی ان کے لیے ممکن نہیں تھی۔ وہ اپنی برادری میں سر اٹھا کر جینا چاہتے تھے اور اس کا یہ ہی ایک طریقہ ان کے پاس تھا۔ اس نے افروز کے منگیتر منصور سے رابطہ کیا۔ اس کا رویہ افروز کے والدین سے بھی گیا گزرا تھا۔

''میں تو پہلے ہی اسے بہت اچھی طرح نہیں جانتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کی حرکتیں کچھ عرصے سے مشکوک سی تھیں۔'' اس نے کہا تھا۔

''وہ کون لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں۔'' عالیہ نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''میں نے سنا ہے کہ آپ

نے افروز سے رشتہ اس کی ذہانت، قابلیت اور سنجیدہ مزاجی کی خبر سن کر جوڑا تھا۔'' جواب میں اس نے سر ہلایا۔

''تو یقین کریں کہ وہ اب بھی اتنی ہی ذہین، قابل اور سنجیدہ مزاج ہے۔'' اس نے اسے باور کرانے کی کوشش کی تھی۔

''اس داغ دار ذہانت، قابلیت اور سنجیدہ مزاج کا مجھے اچار ڈالنا ہے کیا۔ زندگی کی ساتھی کا تو کردار ہی سب سے اہم چیز ہوتا ہے۔ یہ ہی وہ اعزاز ہوتا ہے جس کو مرد ماتھے پر سجا کر فخر سے سر اٹھا کر چلتا ہے۔'' منصور نے ٹکڑا توڑ جواب دیا تھا۔

عالیہ چغتائی کے لیے صورتحال مشکل ترین ہو چکی تھی۔ کیا اس روئے زمین پر وہی ہی پہلی اور آخری ہستی ہے جو افروز کی پاک بازی، معصومیت اور بے گناہی کی گواہی دیتی پھر رہی ہے۔ وہ تو محض دو سال پرانی دوست تھی۔ اس کے ساتھ عمر بھر رہنے والوں کو یقین کیوں نہیں آتا تھا۔

''اب میں اس سے ملوں گی، وہ جو اس ساری تباہی کا ذمہ دار ہے، کیا نام ہے اس کا سعد ابراہیم'' اس نے کچھ بن نہ پڑنے پر افروز سے کہا تھا۔

''اس کا کیا فائدہ ہو گا؟'' افروز اس سلسلے میں قطعی پُرامید نہیں تھی ''اس شام اور اس رات کے حالات دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ اس کا بلکہ ان لوگوں کا تو یہ معمول ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس رات وہ اس اپارٹمنٹ میں اکیلا تھا۔ وہ فون پر کسی شرط کے جیتنے کی بات کر رہا تھا۔''

''اُفوہ، تو تم نے اسے بتایا نہیں کہ تم وہ نہیں ہو، جسے اس نے شرط میں جیتا تھا۔'' عالیہ نے جھنجھلا کر کہا۔

''مجھے ہوش کہاں تھا۔ میں غائب دماغی کی کیفیت میں اس کے سامنے ہاتھ جوڑتی رہی یا شاید میں نے سرنڈر کر دیا پھر شاید میں وقتی موت مر گئی تھی۔ مجھے کچھ یاد نہیں۔''

''مگر وقت کو یاد ہے۔ بہت اچھی طرح یاد ہے، تم اپنی میٹ رپورٹس دیکھو، اس ایک رات نے وہ کارنامہ کر دکھایا ہے جو کئی لوگوں کے ساتھ وقت سالہا سال کی دعائیں اور وظیفوں کے نتیجے میں بھی نہیں دکھاتا۔'' اس بات کے جواب میں افروز چپ چاپ آنسو بہانے لگی تھی۔

''تم ایک بار مجھے اس شخص سے ملنے دو، دیکھو، میں کرتی کیا ہوں۔'' اس نے دعویٰ کیا تھا۔ مگر اس وقت وہ اپنے وعدے کے کھوکھلے ہونے کا ثبوت خود افروز کو سنا کر اس کا رونا سن رہی تھی اور اس کا ذہن مزید منصوبوں کے تانے بانے بن رہا تھا۔

''تمہارے پاس مسز انجی مسعود کا نمبر ہے وہ آنر فاؤنڈیشن والی۔'' اس نے اچانک افروز سے پوچھا تھا۔

☆

اس شام وہ باؤلنگ کلب میں بیٹھے بیٹھے سعید اکبر سے شرط لگا بیٹھا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ وہ سعید کو پوائنٹس کے ساتھ پندرہ منٹ میں شکست دے سکتا تھا۔ سعید اکبر اچھی کمپنی میں بیٹھنے والا شخص نہیں تھا۔ یہ وہ

بہت اچھی طرح جانتا تھا مگر نجانے کس طرح وہ تھوڑے عرصے میں اس کا قریبی دوست بن گیا تھا۔ پہلے وہ کبھی کبھار انتہائی قریبی دوستوں کی انتہائی نجی محفل میں شغلاً ڈرنک کرلیا کرتا تھا مگر سعید نے نایاب شراب کے متعلق اسے بریف کیا تھا اور بہت سوں کے ذائقے چکھاتے وہ اسے اس اسٹیج پر لے آیا تھا جہاں شراب اس کی عادت بنتی جارہی تھی۔ اس نے پہلے کبھی جوانیں کھیلا تھا۔ سعید کا اپنا ذاتی کیسینو اس کے ڈیفنس والے بنگلے کی بیسمنٹ میں بنا ہوا تھا۔ اب وہ اپنی شامیں اسی کیسینو میں گزارنے لگا تھا۔ وہ لڑکیوں سے محض ہلکی پھلکی فلرٹیشن کی حد تک کی دوستی کا عادی تھا۔ سعید نے اسے قیامت قسم کی لڑکیوں سے ملوانا اور ان سے ڈیل کرنے کے طریقے بتانے شروع کردیئے تھے۔ جب ہی اسے پتہ چلا تھا کہ بظاہر بہت اچھے گھرانوں کی شریف صورت لڑکیاں دراصل کہاں سے تعلق رکھتی تھیں اور ان کی جابز (jobs) کیا تھیں۔

سعد ابراہیم کا تعلق طبقہ امراء سے تھا، اس کا باپ ایک کامیاب بیوروکریٹ تھا اور ماں کامیاب بزنس ویمن، زندگی میں سہولتیں تھیں، آرام آسائش اور بچ آف کلاس بھی۔ اس کی دو بہنیں اور ایک بھائی تھا۔ وہ دونوں بہنوں سے چھوٹا تھا، اس نے سینئر کیمبرج کیا تھا اور اس کا ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ وہ لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز سے فنانس میں گریجویشن کے بعد ماسٹرز کررہا تھا اور یہاں بھی اچھا طالب علم سمجھا جاتا تھا۔ مستقبل قریب میں اس کا ارادہ سی ایس ایس کرنے کا تھا۔ اس کا آخری سمسٹر چل رہا تھا، جب سعید اکبر سے اس کی پہلی ملاقات اس کے ایک قریبی دوست رمیز سلطان کی وساطت سے ہوئی تھی۔ سعید سے ملنے سے پہلے بھی وہ کوئی بہت پارسا، راست باز انسان نہیں تھا۔ مگر ممنوعات کو وہ کبھی کبھار کے شغل کے طور پر ہی اپنائے ہوا تھا۔ ممنوعات سعید اکبر سے ملاقات کے بعد ہی اس کی عادات بننے لگی تھیں اور یہ ان ہی سرا ٹھاتی عادات کا شاخسانہ تھا جو وہ پوائنٹس میں جیت جانے پر سعید اکبر کی طرف سے ایک رات کی مکمل عیاشی، یونیورسٹی کے انگلش ڈیپارٹمنٹ کی پٹاخہ لڑکی کے ساتھ منانے کی آفر قبول کرچکا تھا۔

''کیا بہت مشکل ہے وہ لڑکی؟'' اس نے سعید اکبر سے پوچھا تھا۔

''او نہیں یار! عادی مجرم سے عادی مجرم، مگر کیونکہ ذرا ناز وادا اس کے پاس زیادہ اور مختلف ہیں اس لیے پکڑائی مشکل سے دیتی ہے تو اس کے ساتھ ٹائم گزار کر دیکھ، تجھے خود ہی اندازہ ہو جائے گا۔'' سعید نے اسے بتایا تھا۔

حسب توقع اس نے دس منٹ کے اندر ہی سعید کو پوائنٹس پر شکست دے دی تھی، سعید کی آفر سے حظ اٹھانے کا ٹائم آگیا تھا۔ اس کے لیے ہفتے کی رات مقرر کی گئی تھی۔ سعید نے اسے اپنے والے اپارٹمنٹ کی چابی دے دی تھی۔

''وہاں تمہاری مرضی کی ہر شے تمہیں مل جائے گی اس پٹاخے سمیت۔'' اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا تھا۔

زندگی میں ان چھوٹے موٹے ایڈونچرز کا مزاہ لے لینے میں کوئی حرج نہیں تھا اور سعید سے دوستی کے بعد تو اس نے بہت سے ایسے لوگوں کو بھی ممنوعات میں مشغول دیکھا تھا، جو معاشرے کے سامنے انتہائی پارسا، مدبر اور نیکوکار انسانوں کے طور پر پیش ہوتے تھے۔ ان میں سے کئی کو وہ سنجیدہ ٹاک شوز میں بڑی اعلیٰ قسم کی گفتگو کرتے سن چکا تھا۔ سو وہ اس ہفتے کی رات کے سلسلے میں بے حد پرجوش تھا۔

پروگرام کے مطابق شام سات بجے وہ سعید کے اپارٹمنٹ میں پہنچ چکا تھا۔ اپارٹمنٹ کی ایک چابی اس کے پاس تھی۔ اندر داخل ہونے پر اسے اچھا خاصا ڈیکوریٹڈ ماحول ملا تھا۔ اس نے ایک نظر میں ہی بھانپ لیا۔ سعید نے اپنے وعدے کے مطابق اس کی خوشی کا ہر اہتمام کر رکھا تھا۔ اس نے سامنے صوفے پر پاؤں چڑھا کر سکڑی سمٹی بیٹھی لڑکی کو دیکھا۔ ہاں یہ اس کے لیے اچنبھے کی بات تھی وہ لڑکی روایتی سجاوٹ سے پاک تھی۔ بلکہ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور وہ رو رہی تھی غالباً اس کے اندر داخل ہونے پر وہ جیسے دہل کر اپنی جگہ پر مزید سمٹ گئی تھی اور خوفزدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

''دیکھو پلیز مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے واسطے مجھے جانے دو۔'' پھر وہ ایک دم اٹھی اور اس کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

سعد نے حیران ہوتے ہوئے ایک نظر اس کی جڑے ہوئے ہاتھوں پر ڈالی اور پھر اس کی فریاد کرتے الفاظ پر غور کیا۔

''تم کون ہو، تمہیں یہاں کون لایا ہے۔'' اس نے بے ساختہ پوچھا۔

''مجھے معلوم نہیں، مگر خدا کے واسطے میں کسی بھی بات سے بے خبر ہوں۔ مجھے یہاں کون کس لیے لایا ہے میں نہیں جانتی۔''

اس نے اپنے موبائل سے سعید کا نمبر ملایا۔ ''وہ لڑکی کون ہے جو یہاں موجود ہے اور اسے تم کس طرح یہاں لائے ہو۔'' اس نے سعید کی آواز سنتے ہی کہا تھا۔

''ارے یار! یہ وہی ہے اڑیل لڑکی، مان کر نہیں دے رہی تھی۔ دماغ اونچا ہو گیا ہے اس کا فارن کسٹمرز جو لگنے لگے ہیں اس کو۔ اس کی کچھ مت سنو یہ ٹھیک ہو جائے گی تھوڑی دیر میں یو جسٹ انجوائے یور ٹائم۔''

سعید نے اسے خبر دی تھی اور اس کے لیے اتنی ہی تسلی کافی تھی۔ خود کو اچھی طرح نشے میں ڈبونے کے بعد اس نے وہ کھیل کھیلنا شروع کر دیا تھا جس کے بارے میں اس نے سنا تھا کہ جس نے نہیں کھیلا، وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ لڑکی اب بھی چیخ رہی تھی اور فریاد کر رہی تھی مگر سعد کے کانوں اور آنکھوں پر خمار چھا چکا تھا۔ وہ زندگی کے اس تجربے کو محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس جگہ موجود دوسرا ذی روح کیا کہہ رہا تھا اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☆

''میرے پاس ایک اور راستہ بھی ہے۔'' ایک روز عالیہ چغتائی نے اپنے تیار کردہ نئے منصوبے کو ذہن میں مکمل کرنے کے بعد جہاں افروز سے کہا۔ جہاں افروز اس وقت تک تمام منصوبوں، ان پر عمل اور ان کے نتائج کے متعلق سوچنے کی حس کھو چکی تھی۔ وہ سارا دن نیم مردہ، نڈھال حالت میں اس کمرے میں پڑی رہتی تھی، جو عالیہ چغتائی نے اس کے لیے اپنے گھر میں خالی کیا تھا۔ اسے یاد تھا تو صرف اتنا کہ بہت جلد یہ عارضی پناہ گاہ اس سے چھوٹنے والی ہے کیونکہ عالیہ کے بھائی جو پہلے پہل عالیہ کی اس بات پر یقین کرتے رہے تھے کہ اس کی اس دوست کے والدین عمرہ پر گئے ہیں اور چونکہ شہر میں ان کا کوئی دوسرا عزیز، رشتہ دار نہیں ہے اس لیے وہ اسے اپنے ساتھ دوستی کے ناطے لے آئی تھی۔

''تمہاری دوست یونیورسٹی کیوں نہیں جاتی؟''

''وہ اتنی بیمار اور پژمردہ کیوں رہتی ہے؟''

''کبھی اس کے والدین کا فون بھی آیا کہ نہیں۔''

''عالیہ! تم تو بے وقوف ہو۔ راہ چلتوں کو دوست بنا لینے والی، اب یہ ہی دیکھو نجانے کس کو اٹھا کر گھر میں بٹھا لیا۔ اس لڑکی کے تو سارے عنوان ہی مشکوک لگ رہے ہیں۔''

وہ عالیہ کے گھر میں ہونے والی گفتگو سنتی رہتی تھی۔ وہ باتوں کا مفہوم سمجھتی تھی اور اس کے ذہن میں ایک ہی بات کلبلاتی رہتی تھی۔ یہاں سے نکالی گئی تو وہ کہاں جائے گی۔

''میں نے سوچا ہے کہ میں مسز انجی مسعود سے ملوں، سارا قصہ ان کو سناؤں اور یہ معاملہ پریس میں اٹھاؤں۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔'' عالیہ نے اپنا منصوبہ اس کے سامنے پیش کیا۔ ''مسز انجی مسعود کی این جی او نے پہلے بھی اس طرح کے معاملات ہینڈل کیے ہیں۔ تمہیں یاد ہوگا ہم نے پڑھا تھا وہ ساہیوال والی لڑکی کیا نام تھا اس کا کلثوم بی بی اور جڑانوالہ کی جولڑکی تھی شہناز فاطمہ، انہوں نے انصاف دلا کر چھوڑا ان کو۔ آج یہ لڑکیاں یورپین کنٹریز میں عیش کی زندگی گزار رہی ہیں۔''

عالیہ کہہ رہی تھی اور افروز کی آنکھیں خلاء میں اپنا انجانا مستقبل تلاش کر رہی تھیں۔ اسے نجانے کیوں وہاں مسلسل تاریکی نظر آ رہی تھی۔

☆

''ایک بات بتاؤ سعید۔'' اس روز سکواش کورٹ میں کوارٹر فائنل کا ایک میچ دیکھتے ہوئے اچانک سعد نے اپنے ساتھ بیٹھے سعید سے پوچھا۔ سعید نے ریکٹ ہلاتے ہوئے کہا۔

''پوچھو۔ ایک نہیں دو پوچھو۔''

''ایک ہی بات پوچھنی ہے یار! اس روز تمہارے اپارٹمنٹ پر جو لڑکی تھی وہ کون تھی؟''

جواب میں سعید نے طویل قہقہہ لگایا تھا۔ ''کیوں، یاد آ رہی ہے، کیا بہت بھا گئی ہے؟''

''چھوڑو یار مذاق، میں سیریس ہوں۔'' مجھے بتاؤ وہ لڑکی کون تھی؟''

سعید نے اسے غور سے دیکھا۔ ''ارے، تم تو واقعی سیریس ہو۔ اب تو واقعی بتانا پڑے گا۔''

''اب بک بھی چکو'' سعد کو اس کے محظوظ ہونے پر طیش آنے لگا۔

''وہ نینا تھی یار! انگلش ڈیپارٹمنٹ کا بمبار طیارہ، آسانی سے ہاتھ نہ آنے والا، اس کو مار گرانے کے لیے بھی بندے کے پاس فائٹر جیٹ موجود ہونا چاہیے۔''

''تو پھر تمہارے ہاتھ کیسے آ گئی وہ؟'' اب سعد کے لہجے میں بے تابی تھی۔

''ہم یاروں کے یار ہیں جناب، ہم نے سوچا شرط ہاری ہے تو یار سے کیا وعدہ بھی اے ون طریقے سے پورا ہونا چاہیے۔ بہت اڑی کر رہی تھی۔ زبردستی کرنا پڑی تھی۔'' سعید نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''کیوں؟ تمہیں بھی اس کے ساتھ زور آزمائی کرنا پڑی؟''

''اس کی شکل صورت کیسی ہے اس لڑکی نینا کی؟'' سعد نے اس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ اب وہ کورٹ سے نکل کر باہر ریستوران میں آ بیٹھے تھے۔

''بھول گئے یار دیکھی نہیں!'' سعید نے ایک بار بھرپور قہقہہ اور لگایا۔ ''یار میں تو لڑکیوں کی شکل وکل نہیں دیکھتا، لڑکی کا فگر سپرون ہونا چاہیے شکل کو کیا کرنا ہے۔ ویسے بھی کاسمیٹکس کی دنیا میں انقلاب آ چکا ہے۔ یہ بڑے بڑے بیوٹی سیلونز دنوں کے اندر شکل بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسی لیپا پوتی کرتی ہیں کہ ایک بار کے بعد اگلی مرتبہ دیکھیں تو پہچانا مشکل ہو جاتا ہے اور۔''

''سعید! تم پلیز اپنی بانکنا بند کرو اور مجھے اس لڑکی نینا سے دوبارہ ملوا دو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔'' سعد نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''جو حکم میرے آقا۔'' سعید نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری یہ خواہش پوری کرنے کے لیے ایک بار پھر منہ ماری کرنا پڑے گی مس نینا شہزاد سے۔ اس بار تو وہ کسی بیش قیمت جیولری سیٹ سے کم پر نہیں مانے گی۔ وہ جو آئی ہے نا اس کی ''مسز فوزیہ'' اس کی ڈیمانڈز کسٹمر کے اشتیاق کے ساتھ بڑھتی جاتی ہیں۔''

''اس بار یہ پے منٹ میں کر دوں گا، اس بار تو تم کوئی شرط نہیں ہارے نا۔'' سعد نے سنجیدگی سے کہا۔

''پچھلی مرتبہ اسے پے منٹ نہیں ملی تھی مجھ سے۔'' سعید نے انکشاف کیا۔ ''میں نے بتایا نا کہ وہ اڑی کر رہی تھی، ادھر اس کی آنٹی بھی پس و پیش کر رہی تھی۔ ادھر تم سے کیا وعدہ پورا کرنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ اسے زبردستی انھا کرلانا پڑا تھا۔ خیر! ان لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس زبردستی میں بھی ان کی رضامندی شامل ہو جاتی ہے اگر جرمانے کے ساتھ پے منٹ ہو جائے تو۔'' سعید اپنی بانکے جا رہا تھا مگر وہ سن نہیں رہا تھا اس کا ذہن اس بات میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اسے زبردستی اٹھا کر لانا پڑا تھا۔ پیشہ ور لڑکیاں اگر زبردستی لائی

جائیں تو کیا ان کا رویہ وہ ہو سکتا ہے جو اس روز اس نے دیکھا تھا۔

''تم یہ کام جیسے بھی ہو سکتا ہے کرو، اس لڑکی کو اسی جگہ دوبارہ لے کر آؤ۔'' اس نے مزید کچھ کہے بغیر حتمی لہجے میں کہا تھا۔

☆

''وہ آنر فاؤنڈیشن، کا ہیڈ آفس تھا جس میں عالیہ چغتائی اس وقت بیٹھی ہوئی تھی۔ مسز انجی مسعود، ابھی تک آفس نہیں پہنچی تھیں اور وہ ان سے مقرر کئے ہوئے ٹائم سے کچھ پہلے ہی یہاں پہنچ چکی تھی۔ کیا اس نے کبھی سوچا تھا کہ اس میں اتنا اعتماد اور جرأت پیدا ہو جائے گی کہ وہ یوں اس طرح کی جگہوں پر آ کر ان نامور لوگوں کے سامنے کوئی مدعا بیان کر سکے گی۔'' اس کے ذہن میں بار بار یہ ہی بات آ رہی تھی۔ وہ جہاں افروز کے لیے اتنی ہی مخلص تھی جتنا کہ ایک قریبی دوست کو ہونا چاہیے۔ مگر اس نے جواب تک کیا تھا یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور اب تو وہ اپنے گھر والوں کے سوالات کے سامنے بے بس ہو کر رہ جاتی تھی۔ جہاں افروز جس طرح اس کے گھر آئی تھی اور جس حال میں وہ اس کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ وہ کسی کو بھی مشکوک کرنے کے لیے کافی تھا۔ جہاں افروز کے والدین اور بہنوں سے ملنے کے بعد اور خصوصاً سعد ابراہیم کے ہٹ دھرم رویے اور بدمزاجی کو دیکھنے کے بعد اس کے پاس اس کے نزدیک اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ ماسوائے اس طرح کی کسی آرگنائزیشن کو اپروچ کرنے کے۔

اور اب وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے دل میں دعا کر رہی تھی کہ یہاں اس کی بات سن لی جائے۔ پھر مسز انجی مسعود کی آمد ہوئی اور اس نے سارا قصہ ان کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ وہ ان کی عمر، وضع قطع، لباس، میک اپ ہر چیز سے متاثر ہو چکی تھی۔ اوپر سے ان کی نرم گفتاری اور شگفتہ مزاجی اس کے دل میں امید کے پھول کھلائے جا رہی تھی۔

''دیکھو بچے!'' اس کی مکمل بات انتہائی تحمل سے سننے کے بعد وہ گویا ہوئیں۔ اس معاشرے میں آئے روز اس طرح کے واقعات ہونے کا ریشو بڑھتا جا رہا ہے۔ ناہمواریوں، جہالت اور آمرانہ ذہنیت نے مل کر ایک ایسا ماحول ایجاد کر دیا ہے جو ان واقعات کا محرک ہے اور ایک ایسا محرک ہے جس کی ہر جگہ رسائی ہے۔ ان کو پکڑنا، ان کو عبرت بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ تم نے ان لڑکیوں کے نام اور قصے ضرور سنے ہوں گے جو کسی ایسی ہی تنظیم کی وساطت سے میڈیا تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں اور انٹرنیشنل فگر بن گئیں مگر کیا تم نے کبھی یہ بھی سنا کہ ان لڑکیوں کو اس انتہا تک پہنچانے والوں کا انجام کیا ہوا۔ ان کا انجام تو پردے میں گیا، اخبارات ایک روز ایسی خبر کو مین پیج پر لگاتے ہیں اگلے روز اس خبر کے متعلق مزید تفصیل کا کہیں ذکر نہیں ہوتا۔ این جی اوز الگ بدنام ہو رہی ہیں۔ ہم جیسی خواتین پر نام دھرے جا رہے ہیں کہ ہم لوگ بے غیرتی کا کھیل کھیلنے والیوں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ ادھر لڑکیوں نے جب سے یہ سنا ہے کہ

این جی اوز ایسے کیسز کو پروموٹ کرتی ہیں وہ آئے روز ہمارے دفتروں میں نت نئے قصے لے کر پہنچ جاتی ہیں۔ ایسے کہ سچ جھوٹ میں تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''مگر یہ تو سو فیصد سچی بات ہے جو میں نے آپ کو بتائی ہے۔'' عالیہ نے ان کی بات پر حیران ہوتے ہوئے کہا۔

''یقیناً ہو گی۔'' لیکن ہمارے لیے ایک دم فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ ہم اس کیس کے تمام حوالوں سے جانچ پڑتال کریں گے۔ اس کے محرکات، اس کے نتائج متعلقین کے رویے ہمارے لیے ایسا کئے بغیر کوئی بات کرنا مشکل ہو گا۔ ویسے بھی ہم زیادہ تر ان مظلوم عورتوں کے لیے آواز اٹھاتے ہیں جن کے لیے آواز اٹھانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ تم نے کبھی جنوبی پنجاب کی عورت کی حالت دیکھی ہے اور یہاں وسطی پنجاب کے دیہاتوں کی خواتین، جانوروں سے بدتر زندگیاں گزار رہی ہیں۔ ونی کی رسم کی بھینٹ چڑھنے والی عورتوں، غیرت کے نام پر قتل ہونے والی عورتیں، بدلے میں شادی کرا دی جانے والی عورتیں، اجتماعی آبروریزی کے کیسز، ہمارے ہاں ایسی خبروں پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔''

''مگر یہ لڑکی، یہ جہاں افروز۔'' عالیہ نے اپنے خشک ہوتے حلق کو تھوک نگل کر تر کرتے ہوئے کہا۔ ''میڈم! یہ لڑکی بھی اتنی ہی مظلوم ہے، اس کے لیے آواز اٹھانے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ اس کے والدین نے اس سے لاتعلقی کا اظہار کر دیا ہے۔ عزیز، رشتہ دار سب کے سب ساتھ چھوڑ گئے ہیں۔ میں اس کی دوست ہوں مگر میں بھی اسے زیادہ دیر اپنے گھر نہیں رکھ سکتی۔ اس کا کیس توجہ کے قابل نہیں ہے کیا؟''

''ایسا ہے کہ فی الحال۔'' انہوں نے ایک چٹ پر کچھ لکھتے ہوئے کہا۔ ''تم اسے یہاں چھوڑ آؤ۔ یہ سائبان ہے ایک ایسا ادارہ جو ایسی بے آسرا لڑکیوں کو اپنے یہاں پناہ دیتا ہے۔ یہ وہاں رہ لے گی اتنے میں ہم اس کیس کے تمام پہلوؤں پر غور کر لیں گے، اس کے بعد ہی کچھ پیش رفت ممکن ہو سکے گی۔''

''دیکھیں، اس کی تعلیم، اس کا مستقبل اس کی زندگی کے تمام خوابوں کے چراغ ایک ایک کر کے بجھتے چلے جا رہے ہیں۔ وہ مایوس ہو کر امید اور حوصلہ کھوتی چلی جا رہی ہے۔ پلیز آپ اس سلسلے میں اس کی مدد کیجیے۔'' عالیہ نے ایک سعی اور کی۔

''ضرور، ہم ضرور اور حتی الوسع کوشش کریں گے، اب ایسا ہے کہ تم سائبان والوں سے جلد رابطہ کرو اور اگر ممکن ہو تو اپنے ساتھ کی کلاس فیلوز کو آرگنائز کر کے ایک چھوٹی سی احتجاجی ریلی کا انتظام کر لو۔ پلے کارڈز بناؤ بھوک ہڑتال کا اعلان کرو، خبروں میں آنے کی کوشش کرو۔ اس طرح یہ کام آسان ہو جائے گا خصوصاً ہمارے لیے۔'' آخر میں انہوں نے اسے ایک اور نادر مشورہ دے ڈالا۔ عالیہ کو اپنے گھٹنوں میں ارتعاش محسوس ہوا، اس کے گھٹنے اور ٹانگیں کپکپا رہی تھیں۔ وہ ان کے اس مشورے پر عمل کر کے یقیناً اپنے گھر سے بے دخلی کا پروانہ حاصل کر سکتی تھی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے ان کی لکھی چٹ اٹھائی۔

''ہاں، اپنا کانٹیکٹ نمبر دے جاؤ، ہم جلد رابطہ کرنے کی کوشش کریں گے۔'' اسے ان کی آواز آئی۔

''ہاں یہ بات امید افزا تھی۔'' اس نے جلدی جلدی ایک کاغذ پر اپنا موبائل نمبر لکھا، ساتھ میں اپنا نام اور جہاں افروز کا مختصر حوالہ۔

''یقیناً یہ لوگ جلد ہی کوئی کارروائی کریں گے۔ کیونکہ اس بات کے غلط ثابت ہونے کا تو کوئی امکان ہی نہیں۔ خدا کرے کہ ان کی تحقیقات جلد مکمل ہو جائیں'' آنر فاؤنڈیشن'' کے دفتر کے باہر ویگن سٹینڈ پر کھڑی وہ مسلسل سوچے جا رہی تھی۔

☆

سعید اکبر پندرہ دن کے لیے آسٹریا چلا گیا تھا اور اس لڑکی سے دوبارہ ملاقات کا امکان ملتوی ہو چکا تھا۔ ٹینا شہزاد، اسے یہ نام اچھی طرح یاد تھا۔ سعد نے اپنے طور پر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ دو چار دن کے اندر ہی اس لڑکی کے متعلق تمام معلومات اس کی ٹیبل پر موجود تھیں۔ وہ شہر کے ایک پوش رہائشی ایریا میں رہائش پذیر تھی۔ اس کی سرپرست مسز فوزیہ، اس میدان کی پرانی کھلاڑی تھی۔ پہلے وہ اسلام آباد میں اپنا گیسٹ ہاؤس چلاتی تھی، اب کچھ عرصے سے اس نے اپنے کاروبار کی یہ نئی برانچ لاہور میں کھولی تھی۔ اس کے پاس بیک وقت کئی لڑکیاں موجود رہتی تھیں اور یہ سب لڑکیاں انتہائی طرح دار، پڑھی لکھی اور جاذب نظر ہوتی تھیں۔ کوئی شخص مسز فوزیہ کی ڈیمانڈ پوری کرنے کے قابل ہوتا، تو ہی اس کی رسائی ان چھانٹی ہوئی لڑکیوں میں سے کسی تک ہو جاتی تھی۔ ٹینا شہزاد، اس کی ٹیم کا خاص آئٹم تھی اور بظاہر یونیورسٹی کے ڈیپارٹمنٹ کی سٹوڈنٹ تھی۔ شاید اسے دن کے وقت اپنے ڈیپارٹمنٹ میں حصول تعلیم میں مصروف دیکھ کر کوئی شخص بھی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اپنی شاموں اور راتوں میں وہ کس قسم کی ہوشربا شخصیت بن جاتی تھی۔

سعد نے اپنے انتہائی پرسنل نمبر سے مسز فوزیہ سے کانٹیکٹ کیا تھا۔ اس کے والدین کا حوالہ فوزیہ، کو دانہ ڈالنے کے لیے کافی تھا۔ فوراً ہی اس رات ڈنر پر مدعو کر لیا گیا تھا۔ اس نے اس ڈنر کے لیے فوزیہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ٹینا شہزاد سے ملنے کی خصوصی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اس کی اس خواہش پر دوسری طرف سے ہنسنے کی آواز آئی تھی جیسے مسز فوزیہ اپنے خصوصی آئٹم کی شہرت اور مانگ پر خوشی پر قابو نہ پا سکی ہو۔

''شیور۔'' دوسری طرف سے آواز آئی اور سعد نے کال ڈس کنیکٹ کر دی تھی۔ اس کے دل میں ایک عجب سا خوف انگڑائی لے رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد ٹینا شہزاد، سے ملنے کا خواہش مند بھی تھا اور اسے ایسا بھی محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے اندر کوئی اسے آواز دے کر اس ملاقات سے اسے منع کر رہا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچتے ہوئے اس ڈنر پر جانے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔

☆

''بہت ہو چکی مہمانداری، اب اس لڑکی کو رخصت کرو یہاں سے۔'' وہ عالیہ چغتائی کی امی تھیں، جو پندرہ منٹ تک عالیہ سے بحث کرنے کے بعد فیصلہ کن انداز میں بولی تھیں۔

''ایسی نحوست چھائی ہوئی ہے اس لڑکی پر کہ بندے کو خوف آتا ہے اس کی حالت دیکھ کر، عالیہ! تم مانو نہ مانو اس کے ساتھ کوئی گڑبڑ ہے۔'' اس کی بھابی نے دھلے ہوئے کپڑے تہہ کرتے ہوئے اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔

''میں تو بھئی اس کے بابا اور بھائیوں کے سوالوں کے جواب دے دے کر تنگ آ چکی ہوں۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان، مہمان بھی کیا بلائے جان کے مصداق یہ لڑکی تو ہمارے سروں پر مستقل ہی مسلط ہو گئی ہے۔'' اس کی امی دوبارہ گویا ہوئی تھیں۔ عالیہ! جیسے بھی ممکن ہو تم اس کو یہاں سے جانے کا کہہ دو۔ مجھے تو اس کے یہاں موجود ہونے کی وجہ سے ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا ہے نجانے کس وقت کوئی مصیبت ہمارے لیے کھڑی ہو جائے دیکھو اگر تم مروت میں اس کو کچھ نہیں کہہ سکتیں نا تو مجھے کہنے دو۔ مجھے بہت اچھا طریقہ آتا ہے ایسے لوگوں کو چلتا کرنے کا۔''

''امی پلیز، صرف چند دن اور۔'' عالیہ نے روہانسی ہو کر کہا۔ ''دیکھیں جہاں اتنے دن گزر گئے وہاں یہ باقی کے چند دن بھی گزر جائیں گے۔ کیونکہ جلد بازی کا مظاہرہ کر کے اپنی پچھلی مہمان نوازی کے ثواب پر بھی لات مار رہی ہیں، اس کے والدین واپس آئیں وہ خود ہی اس کو لے جائیں گے۔'' یہ آخری جملہ بولتے ہوئے اس کا سر خود بخود ہی جھک گیا تھا۔

''صرف یہ ایک ہفتہ، اس کے بعد میں تمہاری کوئی بات مزید نہیں سنوں گی۔ نجانے کیسے والدین ہیں جو بچی کو یوں لاوارثوں کی طرح سہیلی کے گھر چھوڑ گئے ہیں۔'' امی کو اس کی مہمان نوازی کے ثواب پر لات مارنے والی بات پر شاید خوف آ گیا تھا اور وہ نرم پڑتے ہوئے بولیں۔

''ایک ہفتہ، ایک ہفتہ کرتے ڈیڑھ مہینہ گزر گیا، عمرے کا ویزا کتنے دنوں کا لگتا ہے بھلا۔'' بھابھی اس مہمانداری کا مزید ثواب کمانے کے موڈ میں قطعی نہ لگتی تھی۔

''چلیں اب یہ فیصلہ ہو گیا نا کہ ایک ہفتہ مزید۔ اب پلیز آپ لوگ کچھ مت بولیے گا۔'' عالیہ نے بات ختم کرنے کی کوشش کی جبکہ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ اگر جہاں افروز اس کی بجائے کسی اور کی دوست بن کر یہاں اسی گھر میں آئی ہوتی تو اس کا حلیہ، حالت اور انداز دیکھ کر وہ بھی یونہی مشکوک سوالات کرتی پھرتی۔

اس شام اس نے مسز انجی مسعود سے دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کی وہ شہر میں موجود نہیں تھیں۔ اس نے ان کی سیکرٹری سے بات کی وہ جہاں افروز کے کیس کے سلسلے میں زیادہ پرامید نہیں تھی۔

''آپ سعد ابراہیم کی بات کر رہی ہیں ہم نے پتہ کرایا ہے، وہ ملک کے ایک انتہائی معزز گھرانے کا

فرد ہے اور اس کے کردار میں کسی قسم کا ایسا جھول نہیں ہے جس کو دیکھ کر اس پر اس طرح کی حرکت کا مرتکب ہونے کا شک کیا جا سکے۔ مشکل ہی ہے جو ''آنر فاؤنڈیشن'' اب بات کو کسی فورم پر اٹھانے کی حماقت کرے گی۔'' انجی مسعود کی سیکرٹری نے اس کی امیدوں پر برف گراتے ہوئے کہا تھا۔ ''پھر بھی آپ میڈم کے کراچی سے واپس آنے کا انتظار کریں اور ان کے آنے کے بعد رابطہ کریں۔''

''وہ کیا رابطہ کرے گی۔'' اس نے مایوس ہو کر سوچا تھا۔ اس روز اس کا دل دھاڑیں مار مار کر رونے کو چاہ رہا تھا اس نے اپنی بساط سے بڑھ کر کوششیں کر کے دیکھ لی تھیں اور اسے اپنی امیدوں سے بڑھ کر نا کامیوں کا سامنا کرنا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے سائبان کا ایڈریس اپنے بیگ سے نکالا اور وہ اس فون نمبر پر کال کرنے کی کوشش ہی کر رہی تھی جب اسے اپنے عقب سے اپنے بھائی زین چغتائی کی آواز آئی۔

''دیکھو جو اصل قصہ ہے نا وہ سچ سچ مجھے بتا دو۔ شاید میں تمہاری کچھ مدد کر سکوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں زین کو دیکھا وہ اس سے ایک سال چھوٹا تھا مگر اپنے قد و قامت کی وجہ سے کئی سال بڑا لگتا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لیے سوچا اور پھر مزید کچھ نہ سوچنے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے انتہائی ایمانداری اور سچائی سے جہاں افروز کا قصہ لفظ بہ لفظ اسے سنانے لگی۔

''تم بے وقوف ہو، انتہائی احمق اور جذباتی۔'' اسے پوری توقع تھی کہ زین اس کی بات سن کر یہ ہی کہے گا اور اس نے یہ ہی کہا تھا۔

''اب ابا اور امی کو یہ بات پتہ چلے تو اس تمہاری دوست کے ساتھ جو ہو سو ہو۔ خود تمہارے ساتھ کیا ہوگا۔'' وہ اسے متوقع صورتحال سے بھی آگاہ کر رہا تھا۔

''تم نے میری بات سننے سے پہلے کہا تھا کہ تمہیں اصل واقعہ سناؤں شاید تم میری کچھ مدد کر سکو، مگر تم سوائے مجھے ڈرانے کے اور کچھ بھی نہیں کر رہے ہو۔'' عالیہ نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ زین سے ایک سال کے فرق کے باوجود اس کی شاید ہی کبھی اس سے بنی تھی اور اب وہ پچھتا رہی تھی کہ اس نے گھبرا کر یہ بات زین کے ساتھ کیوں شیئر کر لی۔

''خیر، مانتے میں تو نہیں آتی یہ بات کہ تمہاری دوست اتنی معصوم ہوگی جتنا تم بتا رہی ہو خیر پھر بھی ایسی صورت حال میں تمہیں امی ابا کے عتاب سے بچانے کے لیے۔ میں اس سلسلے میں کچھ سوچتا ہوں۔'' اس کے پریشان حال چہرے کو دیکھتے ہوئے زین نے زندگی میں پہلی مرتبہ اس سے کوئی انسانوں والی بات کی تھی۔

''میرے ایک دوست کی بہن ہیں ماریہ آپی، وہ ڈیفنس میں رہتی ہیں اکیلی طلاق یافتہ ہیں اور کیریئر وومین بھی۔ ان سے بات کر کے دیکھتے ہیں جو وہ تمہاری دوست کو کچھ دن اپنے پاس رکھ لیں۔''

''تم اگر ایسا کرا لو گے تو بہت بڑی نیکی کرو گے۔ اور اس سے بڑی نیکی کیا ہوگی۔'' عالیہ نے سر سے

ایک بھاری بوجھ ہٹ جانے کے امکان کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔

''فی الحال تو میں یہ کام اس لیے کروں گا کیونکہ ایسا نہ ہونے کی صورت میں تم پر جو عتاب نازل ہوگا اس سے تمہیں بچانا میرا فرض بنتا ہے۔'' عالیہ کبھی توقع نہیں کر سکتی تھی کہ زین اس کے لیے اتنی سنجیدگی سے سوچے گا۔ مگر اس وقت وہ یہ بات سوچنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ زین اس مسئلے کو اتنی سنجیدگی سے کیوں لے رہا تھا۔

''تم کب بات کرو گے ان آپی سے؟'' اس نے بے تابی سے پوچھا تھا۔

''دیکھو۔'' زین نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''شاید آج شام کو ہی۔''

عالیہ کے سر سے بھاری بوجھ اتر گیا۔ خدا تعالیٰ مسبب الاسباب تھا۔ یقیناً وہ جانتا تھا کہ مسئلہ اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا اسی لیے اس نے یہ وسیلہ بنایا تھا۔ وہ یقیناً مطمئن ہوگئی تھی اور یہ بات جہاں افروز کو سنانے کے لیے بے چین تھی۔

اس شام جب وہ زین کی واپسی کا انتظار کر رہی تھی اس کے موبائل کی بیپ نے اسے چونکا دیا۔ پہلا خیال اسے یہ ہی آیا تھا کہ زین ان خاتون سے بات کرنے کے بعد فوری طور پر گھر نہ آ سکا ہوگا اس لیے اسے فون پر کوئی اطلاع دے رہا ہوگا۔

''جیو زین۔'' اس نے اپنا موبائل میز پر سے اٹھاتے ہوئے سوچا اور اس کی سکرین پر نظر دوڑائی۔ مگر یہ نمبر زین کا نہیں تھا۔

☆

آدھی رات کو اس کی نیند ایک زور دار جھٹکے سے ٹوٹی تھی اور وہ گھبرا کر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور وہ پسینے میں شرابور تھا۔ اس نے سامنے کی دیوار پر نظر دوڑائی، اے سی کی دونوں لائٹس آن تھیں اور وہ جیٹ کول پر سیٹ تھا۔ پھر اس نے سائیڈ ٹیبل پر دھرے موبائل کو اٹھا کر وقت دیکھا۔ اس وقت رات کے اڑھائی بج رہے تھے۔ اس رات وہ تقریباً ساڑھے بارہ بجے سونے کے لیے لیٹا تھا اور اسے خاصی گہری نیند آئی تھی۔ پھر وہ کیا بات تھی جس نے اسے یوں اٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس پر عجیب سی گھبراہٹ کیوں سوار تھی۔ اس نے اٹھ کر واش روم کا رخ کیا اور پے در پے اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تھے۔ پھر اس نے یاد کرنے کی کوشش کی اس رات اس نے ڈنر میں کیا کھایا تھا۔ پھر اسے یاد آیا اس نے چائنیز فوڈ کھایا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ معدے کی گرانی کے سب اس کی یہ کیفیت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے واش بیسن کے اوپر لگے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ اسے اپنے چہرے پر زردی سی نظر آئی تھی اور پھر اسے یوں بھی محسوس ہوا، جیسے اس کا دل بری طرح مسلا جا رہا ہو۔ یقیناً وہ کسی نفسیاتی دباؤ کے زیر اثر تھا۔ اس نے خود ہی اندازہ لگایا اور بے جان قدموں سے چلتے ہوئے واپس بیڈ روم میں آ گیا۔ اس کے بیڈ سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ٹرینکولائزرز موجود تھیں۔ اس نے دراز کھول کر ایک گولی نکالی اور بیڈ روم ریفریجریٹر سے پانی کی بوتل نکال کر

ایک گھونٹ کے ساتھ گولی نگل لی۔ اس کے بعد لائٹ آف کر کے وہ ایک گھنٹے تک نیند آنے کا انتظار کرتا رہا۔ مگر اس کی آنکھیں اور ذہن دونوں جاگ رہے تھے۔ ایک گھنٹہ کے بعد اس نے دوسری گولی نگلی مگر نیند کوسوں دور تھی۔ صبح تقریباً ساڑھے پانچ بجے اس نے یوں نیند کو اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش ترک کر کے اپنی اس صورتحال پر غور کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے ذہن اور آنکھوں کے سامنے کچھ منظر روشن ہو گئے۔ الفاظ، آوازیں وہ جو نامانوس نہیں تھیں اس کے اردگرد پھیل گئیں۔ صبح سات بجے تک سعد ابراہیم اپنی بے چینی دل کو بوجھ اور گھبراہٹ کے سبب کو اچھی طرح جان چکا تھا۔

☆

وہ اس شام ساڑھے آٹھ بجے کے قریب مسز فوزیہ کے بنگلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس گھر میں داخل ہونے پر اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس نہیں ہوا تھا، جبکہ اس کا خیال تھا کہ ایسے گھروں میں جہاں اس قسم کا کاروبار ہوتا ہے یقیناً روٹین سے ہٹ کر کچھ ہوتا ہوگا۔ اس نے چوکیدار کو اپنا وزیٹنگ کارڈ پکڑایا اور خود اس لش گرین گھاس والے لان میں رکھی خوب صورت اور نازک کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ لان میں قریباً پانچ جگہوں پر لائٹ پولز نصب تھے اور ان پر روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ وہ بغور اپنے اردگرد کی ہر چیز کا معائنہ کر رہا تھا جب اندر سے اس کا بلاوا آ گیا۔ اس گھر کا انٹریر انتہائی خوبصورت تھا اس نے دل ہی دل میں اس ذوق والے بندے کو داد دی، جس نے اس کو سجایا تھا۔ وہ لاؤنج ٹائپ کوئی کمرہ تھا جس میں لگے صوفوں کی قطاروں میں سے ایک صوفے پر مسز فوزیہ بیٹھی تھی۔ انتہائی کھلے گلے کے بغیر آستین کے مختصر سے بلاوز پر شیفون کی باریک پرنٹڈ ساڑھی میں ملبوس، سعد خود بھی سمجھ نہیں سکا تھا کہ اس عورت کو دیکھ کر اس کا دل کیوں متلا گیا تھا۔ وہ اسے انتہائی پروفیشنل انداز میں مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ غالباً سعد کے عقب میں اسے نوٹوں کی گڈیاں، ہیرے جواہرات اور آسائشات نظر آ رہی تھیں۔ ورنہ سنا تھا کہ وہ عام آدمی کو لفٹ نہیں کرواتی تھی۔

''آپ کا یہاں آنا زہے نصیب۔'' وہ کہہ رہی تھیں سعد نے اس قسم کی عورتوں کے منہ سے تقریباً اسی قسم کے ڈائیلاگز سنے تھے۔ شاید اسی لیے اسے مسز فوزیہ کے منہ سے نکلنے والے ان ڈائیلاگز پر کسی نئے پن کا احساس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس کے سامنے بیٹھے اس آدھے گھنٹے میں تقریباً دس مرتبہ اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی تھی۔ وہ اس کو غالباً ٹینا شہزاد، کے لیے اس کی بے چینی سمجھی تھی اور زیر لب بڑے معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھی۔ ٹینا شہزاد کو وہاں بلانے میں دیر کر کے وہ شاید اس کے شوق کو ہوا دینا چاہتی تھی۔

''سعد ابراہیم صاحب! ٹینا کی آج کی رات آپ کے لیے بک ہو چکی، مگر ہم ایڈوانس پے منٹ پر یقین رکھتے ہیں۔ اس بات کا برا نہ مانیے گا ہر کاروبار کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔''

''یقیناً۔'' سعد نے بھاری آواز میں کہا، وہ اس ماحول سے نجانے کیوں فیڈ اپ ہو رہا تھا۔ آپ مس

نینا کو بلوائیے، پے منٹ میں ان کی موجودگی میں ابھی کر دوں گا۔''

''ہوں۔'' مسز فوزیہ کے چہرے کا زاویہ ایک لمحے لیے بگڑا تھا مگر پھر اس نے اس کو فوراً ہی درست کر لیا۔ پھر اپنے موبائل پر اس نے کوئی نمبر ملایا تھا۔ یہ غالباً محض بیل ہی تھی کیونکہ بغیر بات کیے کچھ دیر بعد اس نے موبائل بند کر دیا تھا۔

''آپ کی شخصیت شاندار ہے۔ آپ بے حد ہینڈسم اور مردانہ وجاہت کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔'' پھر اس نے مسکرا کر کہا تھا۔ سعد کے لیے یہ نئی اطلاع نہیں تھی۔ مرونا بھی شکریہ نہیں کہا۔

وہ خود پر کنٹرول کر رہا تھا۔ نک، نک، نک کی آواز کی ساتھ کے بائی ہیل پر پاؤں جمائے کوئی سیڑھیوں سے اترا سعد نے ایک گہری نظر آنے والی پر ڈالی۔ وہ بھی بغیر آستین کی مختصر سی شرٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس تھی۔ اس کی شرٹ کے رنگ خاصے شوخ تھے اور اس کا میک اپ بھی۔

''آؤ بھئی نینا! تمہارے مہمان خاصے بے چین ہیں۔'' فوزیہ نے مسکرا کر کہا تھا اور وہ ایک ادائے دلبرانہ کے ساتھ سعد کے بالکل ساتھ آ کر بیٹھ گئی۔

''آپ نینا شہزاد ہیں!'' کچھ لمحوں کی خاموشی کے بعد کمرے میں سعد کی آواز ابھری تھی۔

''آپ کو یقین نہیں آ رہا کیا؟'' وہ اس کے شانے پر بازو جما کر بولی تھی۔

''کتنی پے منٹ کرنی ہے مجھے؟'' ایک گہرا سانس لے کر سعد نے مسز فوزیہ کو مخاطب کیا تھا۔ اس کے بتانے پر اس نے جیب سے ایک بلینک چیک نکال کر اس پر وہ رقم لکھنے کے بعد اپنے دستخط کیے اور چیک مسز فوزیہ کی طرف بڑھا دیا۔

''شکریہ۔'' وہ مسکرائی اور اٹھ کر جانے کے لیے اپنی جگہ سے ہلی۔

''پلیز۔'' سعد نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور انتہائی نرمی سے اپنے شانے سے نینا کا بازو ہٹا کر کھڑا ہو گیا۔

''یہ ادا نگی آپ کا قیمتی وقت لینے کی ہے، میں اب چلوں گا۔'' وہ ان دونوں کو حیرت سے اپنی طرف دیکھتا چھوڑ کر کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

☆

''سعید! وہ لڑکی جو اس روز تمہارے اپارٹمنٹ میں موجود تھی وہ نینا شہزاد نہیں تھی۔'' اس کے ٹھیک پانچ دن بعد وہ سعید اکبر سے اس کے آفس میں بیٹھا بحث میں الجھا ہوا تھا۔

''کم آن یار، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔'' سعید یہ بات ماننے کو تیار نہیں تھا۔ جواب میں اس نے مختصراً اسے اپنی مسز فوزیہ اور نینا سے ملاقات کا احوال سنایا۔

''اچھا، ایک منٹ ٹھہرو، میں ابھی چیک کر لیتا ہوں۔'' سعید نے اس کی بات سننے کے بعد اپنے

موبائل پر کسی کا نمبر ملایا اور دوسری طرف والے بندے سے مخاطب ہوا۔ اس کی یہ گفتگو پشتو زبان میں ہو رہی تھی۔ جس کا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سعید نے موبائل بند کر کے اس کی طرف دیکھا۔

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو، وہ ٹینا نہیں تھی۔''

''پھر وہ کون تھی، اور وہاں کیسے پہنچ گئی؟''

''ٹینا روزانہ نادر خان کی ٹیکسی پر گھر جاتی ہے، اس روز نادر خان بیمار تھا جب میں نے اسے ٹینا کو اپنے اپارٹمنٹ پر لے آنے کے لیے کہا تھا۔ اس کی جگہ اس کا دوست سمیع خان ٹیکسی چلا رہا تھا۔ نادر خان نے اسے ٹینا کے سٹاپ اور وقت کے بارے میں بتا دیا تھا اور یہ بھی بتایا تھا کہ اس کے ہاتھ میں چند کتابیں یا ایک دو فائل ہوں گے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ سمیع خان کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ لڑکی اپنے روٹ سے ہٹ کر کہیں اور لے جانے پر جھگڑا کرے گی، شور مچائے گی گالیاں دے گی مگر اسے پروا نہیں کرنی اور ایسا ہی ہوا تھا۔ لڑکی کو سمیع خان نے اپارٹمنٹ میں موجود حیات خان کے حوالے کیا تھا۔ اس وقت تک وہ تقریباً بے ہوش ہو چکی تھی، ان دونوں کو اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اندر لانا پڑا تھا۔''

''تمہیں پتہ ہے تمہاری یہ ناقص منصوبہ بندی اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کیا گل کھلا چکی ہے۔'' سعید سے یہ ساری تفصیل سن کر سعد اس پر برسا۔

''دیکھو مجھے کیا معلوم تھا کہ اس روز ٹینا وہاں نہیں پہنچے گی اور کوئی اور لڑکی وہ ٹیکسی روک لے گی۔ نادر خان ہوتا تو یہ غلطی کبھی نہ ہوتی۔'' سعید نے لاپروائی سے کہا۔

''ویسے تم بھی خوب ہو تمہیں پیشہ ور لڑکی اور دوسری لڑکی میں کوئی فرق نہیں لگا۔ ٹھہرو میں ذرا ٹینا سے بھی یہ بات کنفرم کر لوں۔'' پھر اس نے ٹینا کا نمبر ملایا۔

''وہ کہہ رہی ہے کہ میری طرف اس کی کوئی پے منٹ باقی نہیں ہے۔ سو یہ تو بالکل کلیئر ہے کہ وہ لڑکی ٹینا نہیں تھی۔'' فون بند کر کے اس نے وہ بات بتائی جو سعد پہلے سے جانتا تھا۔ ''ہاں تمہارا ذکر وہ بہت اشتیاق سے کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ تمہارا یہ دوست شاید روزہ رکھنے کی پریکٹس کر رہا ہے۔ مطلب کی اشیاء سامنے دیکھ کر بھی بھوکا چلا جاتا ہے۔'' پھر اس نے سعد کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ مگر اب سعد اس کی بات نہیں سن رہا تھا۔ اب وہ اس وقت کو کوس رہا تھا جب وہ سعد کے کہنے پر زندگی کے نئے نئے رنگ دریافت کرنے نکل کھڑا ہوا تھا۔

''وہ لڑکی جو غلطی سے وہاں پہنچا دی گئی سعید، اس کا پتہ ہے تمہیں؟'' پھر اس نے پوچھا۔

''نہیں۔'' سعید نے شانے اچکا کر کہا۔ ''نجانے کون تھی خاتون، وہ شاید اس کا برادن تھا۔''

''اس کا پتہ چلاؤ تم، وہ کون تھی، کہاں رہتی ہے، یقیناً وہ بھی اسی جگہ کہیں سٹوڈنٹ ہی ہو گی نا۔'' سعد

نے بلند آواز میں کہا۔

''آرام سے یار۔'' سعید نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔''جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جو بھی تھی اس نے اس کے بعد تم سے یا مجھ سے رابطہ تو نہیں کیا نا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اس حقیقت کو قبول کر چکی ہے۔''

''حقیقت کو قبول کرنے کے بچے، تمہیں کیا پتہ تمہاری اس حماقت کی وجہ سے کسی کا کتنا نقصان ہو چکا ہوگا۔ مجھے خود وہ مڈل کلاس کی ایک عام سی لڑکی لگی تھی اور میں تمہارے زمین و آسمان کے قلابوں پر حیران بھی تھا۔ مگر میری عقل بھی تمہاری گفتگو کے جال نے پھنسا رکھی تھی۔ وہ نجانے کون تھی اور ایک رات گھر سے غائب رہنے کی پاداش میں نجانے اس کے ساتھ کیا ہوا ہوگا۔''

''کچھ بھی نہیں ہوا ہوگا۔'' سعد نے بے نیازی سے کہا۔''یہ لڑکیوں کی ساری لاٹ تو ایک جیسی ہوتی ہے۔ اسے کچھ ہوا ہوتا تو اب تک خبر آ چکی ہوتی۔ مڈل کلاس کے لوگ تو یوں بھی اپنی عزتیں چھپاتے پھرتے ہیں۔''

''سعید! مجھے اس لڑکی کے متعلق پتہ کر کے بتاؤ۔'' سعد نے اس کی کسی بھی بات کا نوٹس نہ لیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے پتہ کر لیتے ہیں۔'' سعد اس کے تیور دیکھ کر بولا''اور جو نقصان نفع وہ بتائے گی، اس کو پورا کر دیں گے۔ روکڑا'' پھر اس نے چٹکیوں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا''روکڑا میری جان، سب مسئلوں کا حل ہے اور سب کی ضرورت بھی۔ امید ہے کہ اس حماقت کے عوض چند روپے تمہاری تسلی کرا دیں گے۔''

''تم کب اس کا پتہ کروا کے بتاؤ گے مجھے؟'' سعد ہنوز سنجیدہ تھا۔

''یقیناً آج شام تک۔''

''ٹھیک ہے میں انتظار کروں گا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

☆

اس شام تک سعد لڑکی کے بارے میں کچھ معلوم نہ کروا سکا تھا۔ ماسوائے اس کے کہ انگلش ڈیپارٹمنٹ کی ایک لڑکی پچھلے کئی دن سے غیر حاضر تھی۔ وجہ کسی کو معلوم نہ تھی۔

اور اسی رات سے سعد ابراہیم کو نیند نہ آنے کی بیماری نے آ گھیرا تھا۔ وہ بے حد حقیقت پسند اور سخت مزاج لڑکا تھا۔ بہت کم باتیں اس کو جذباتی کرنے میں کامیاب ہو پاتی تھیں مگر اس کی نفسیات اس ایک واقعے کی بازگشت کے آگے جیسے سرنڈر کرتی جا رہی تھی۔ اسے خود بھی حیرت ہوتی تھی کہ وہ ایسے معاملات کی پروا کیوں کرنے لگا تھا۔ مگر اسے اس روز کلب میں اپنے سامنے آ کر رونے والی لڑکی اور اس کی گفتگو جو اس وقت اس نے دھیان سے سنی بھی نہ تھی۔ حیرت انگیز طور پر پوری کی پوری بلا کم و کاست یاد آنے لگی تھی اور بعض اوقات تو تنہائی میں اس لڑکی کے کوسنے، بددعائیں، التجائیں، اتنی بلند آواز میں اس کے کانوں میں گونجنے لگتے

کہ وہ گہری نیند سے ایک دم بیدار ہو جاتا۔ اس ایک ہفتے کے دوران جب تک سعید اکبر اسے اس لڑکی کے بارے میں تمام تفصیل مہیا نہ کر پایا تھا وہ ٹرنکولائزرز کا عادی ہو گیا تھا۔ اس کی روزمرہ روٹین بدل گئی تھی۔ اس کی ماما اور چھوٹا بھائی اس کی بدلی ہوئی روٹین کو محسوس کر رہے تھے اور اس سے پوچھتے بھی رہتے تھے کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہوا تھا۔ مگر وہ اپنے پیدا کیے ہوئے اس مسئلے کو خود ہی حل کرنا چاہتا تھا۔

☆

''سعد ابراہیم۔'' عالیہ چغتائی نے اس غیر متوقع کال کو سننے کے بعد زیر لب دُہرایا۔

''وہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ کس لیے۔'' اس نے سوچا ''کہیں اس روز والی میری حرکت کا بدلہ لینے کے لیے تو نہیں۔'' پھر اس کے دل میں خوف جاگا۔ ایسے لوگوں کا کیا بھروسہ، ایک کے بعد دوسرا۔ ان کو تو یہ کھیل کھیلنے کی عادت ہوتی ہے مگر کیا معلوم کہ وہ ڈر گیا ہو، پھر اسے دوسرا خیال آیا۔ مسز انجی مسعود نے اگر اس واقعے کی تحقیقات کرائی ہوں تو اس کے کانوں میں تو ضرور کچھ پہنچا ہوگا۔ جب ہی ڈر کر اس نے رابطہ کیا ہے۔ ان لوگوں کو اپنی ظاہر داری سے پیاری بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔'' پھر اسے دوسرا خیال آیا۔ وہ کیا کروں کیا نہ کروں کی کیفیت میں پھنس گئی۔ مگر اس کے پاس وقت کم تھا اور اسے جو بھی کرنا تھا فوری طور پر کرنا تھا۔ اسی رات زین نے گھر واپسی پر اسے بتایا کہ اس کے دوست کی آپا کے ہاں مہمان ٹھہرے ہوئے تھے اور فی الحال تو کسی سے بندے کے لیے ان کے پاس گنجائش ہی نہیں تھی لہٰذا اس نے یہ بات ان سے کی ہی نہیں تھی۔

''پھر کیا کریں؟'' اس نے پرامید نظروں سے زین کو دیکھا۔ شاید وہ کوئی اور حل بتائے۔

''کیا بتاؤں۔'' زین نے شانے اچکا کر سر نفی میں ہلایا وہ کوئی حل بتانے سے قاصر تھا۔

''میری مانو اسے چلتا کرو صبح ہی، امی کی دی ہوئی مہلت پوری ہونے والی ہے۔ تم نے خاصی دوستی نباہ لی۔''

ایک لمحے کے لیے عالیہ کے دل میں آیا وہ زین کو سعد ابراہیم کے فون کے متعلق بتائے۔ مگر پھر وہ خاموش رہی وہ جانتی تھی کہ وہ اسے اس شخص سے ملنے سے صاف منع کر دے گا۔ اسی رات جہاں افروز انتہائی لو بلڈ پریشر کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی اور اسے ایمرجنسی میں ہسپتال لے جانا پڑا تھا۔ عالیہ نے اسے ہاسپٹل لے جانے کے لیے دانستہ زین کو ساتھ لیا تھا۔ کم از کم وہ کوئی الٹے سیدھے سوال تو نہ کرتا۔ وہ اس کی ممنون تھی عمر بھر اس کے ساتھ ایک پل نہ بننے والے بھائی نے اس موقع پر کم از کم اتنا تو ساتھ دیا تھا کہ اس سے سن کر کسی اور کو نہیں بتایا تھا۔ ہاسپٹل سے واپسی پر جہاں افروز کو اس کے کمرے میں لٹا کر باہر آتے ہوئے اسے سب گھر والوں کے انتہائی خراب موڈ نے سعد ابراہیم سے مل لینے کا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ یہ آخری پلان تھا جس پر عمل کرنے کا فیصلہ اسے کرنا پڑا تھا۔

☆

''مسز انجی مسعود۔'' سعد ابراہیم نے یہ نام سن کر استہزائیہ قہقہہ لگایا تھا۔ ''تمہارا خیال ہے کہ میں اس قسم کی کوششوں سے ڈر کر تم سے رابطہ کر رہا تھا۔'' عالیہ چغتائی اس وقت اسی کلب کے مستقل ممبرز والے لاؤنج میں اسی ٹیبل پر اس کے سامنے بیٹھی تھی، جس پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنا مدعا کچھ دن پہلے سعد کے گوش گزار کیا تھا۔

''آئی ڈیم کیئر۔'' اس نے اپنے ٹینس ریکٹ کے کور سے نامحسوس گرد جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''مسز انجی مسعود، مجھے اور میری فیملی کو اچھی طرح جانتی ہیں اور ان پر میرے فادر کے اتنے احسانات ہیں کہ وہ کسی سے میرے متعلق ایسی خبر سن کر اسے پاس سے گزرنے والی ہوا سے بھی شیئر کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتیں وہ کیا شہر کی بلکہ اس ملک کی کسی بھی ایسی تنظیم میں چلی جاؤ اور یہ معاملہ اٹھا کر دیکھ لو۔ جو کوئی سن لے تمہاری۔''

''پھر تم نے مجھے یہاں کیوں بلایا ہے؟'' عالیہ کو اس کے لہجے کے استہزاء نے برافروختہ کر دیا۔ ''اس لیے کہ وہ لڑکی جہاں افروز تمہارے پاس ٹھہری ہوئی ہے۔''

''ہاں مگر یہ بات میں نے اس روز تمہیں بتائی تھی۔''

''اس روز کی بھول جاؤ، اس روز میں نے شاید ہی تمہاری کوئی بات دھیان سے سنی ہو۔'' سعد پچھلے ایک ہفتے کے رت جگے کو بھلا کر بولا۔ اسے اس وقت اپنے لہجے کو مضبوط بنا کر رکھنا تھا۔

''تو کیا دوبارہ سے سناؤں؟'' عالیہ نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

''نہیں۔'' سعد نے سر ہلایا ''مجھے معلوم ہے، خود ہی معلوم ہے، میں صرف بتانا چاہتا ہوں کہ اس روز جو بھی ہوا وہ غلط فہمی کا نتیجہ تھا اور میں نے یہ پوچھنے کے لیے تمہیں بلایا ہے کہ اس کا حل کیا ہے؟''

''تم کیا سمجھتے ہو؟'' عالیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''بلینک چیک کاٹ دوں، اس کی تمام زندگی کے لیے کافی رقم مل جائے گی، اس کو اور کیا چاہیے اس کو اور اگر کوئی پریگنینسی کا چکر ہے تو وہ بھی حل ہو جائے گا یوں۔'' اس نے چٹکی بجا کر کہا۔

''اسے نہ رقم چاہیے، نہ دوسرے مسئلے کا حل، اسے جو چاہیے اُس کی قیمت تم شاید دے نہ سکو۔'' سعد کے انداز پر عالیہ نے زہرخند لہجے میں کہا اسے اس شخص کے غرور اور اعتماد پر سخت غصہ آ رہا تھا۔

''وہ کونسی ایسی چیز ہے؟'' اس نے ابرو چڑھا کر پوچھا۔

''اسے عزت درکار ہے۔ وہ عزت جس کے چلے جانے پر اس کے والدین، بہن بھائی اس کی تعلیم، اس کا مستقبل اس سے چھوٹ گیا۔ اسے اس عزت کی واپسی ہی زندگی کی نوید دے سکتی ہے، ورنہ جو اس کی حالت ہے وہ شاید چند دن ہی زندہ رہ سکے۔''

''عزت۔'' سعد نے زیرلب دُہرایا۔ ''یہ بھی اچھا فنامنا ہے۔ عزت کی زندگی تو بابا میں دے رہا ہوں نا پیسہ، پیسہ پاس ہو تو عزت خود بخود مل جاتی ہے۔''

''یہ تمہاری سوچ ہے، جو انتہائی گھٹیا ہے پیسے سے خریدی ہوئی عزت تمہیں جچتی ہوگی ہم جیسے پیدائشی عزت داروں کو نہیں۔ انا، خودداری کو گلی چوٹ اور اپنی ہی نظروں سے گر جانے کا غم پیسہ دور نہیں کر سکتا۔'' عالیہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''پھر کیا حل ہے اس انتہائی الجھی ہوئی عزت کی واپسی کا، میں اپنی غلطی کا اعتراف کر چکا ہوں اور اس کا خمیازہ بھگتنے کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔'' پہلی مرتبہ سعد کا لہجہ نرم پڑا۔

''اس کی عزت کی بربادی کے ذمہ دار تم ہو، اس عزت کو تم ہی واپس کر سکتے ہو۔ اس سے شادی کر لو، اس کے دل سے کچلے جانے کا غم نکل گیا تو شاید وہ پھر سے جی اٹھے۔ تمہیں کیا فرق پڑے گا نکاح کے ایک کاغذ سے۔ ایک ایسا کاغذ جو کسی کو موت کے منہ سے واپس لا سکتا ہے؟'' عالیہ کے الفاظ نے سعد کو گنگ کر دیا تھا۔

''میں اس کو جانتا تک نہیں۔'' اس نے بمشکل یہ لفظ کہے تھے۔

''وہ بھی تمہیں جانتی تک نہیں تھی۔ جب تمہاری خاطر اسے اٹھا لے جایا گیا تھا۔ تم جیسے زمانے کے خداؤں کو اس اوپر والے کی پکڑ سے ڈر نہیں لگتا۔'' عالیہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ الفاظ کے کون سے تیر ایسے ہو سکتے تھے، جو اس شخص کے سینے میں پیوست ہو جاتے۔

''ایک جیتے جاگتے انسان کی زندگی برباد کر کے تم سکون سے کیسے رہ لیتے ہو۔ تمہیں معلوم ہے کہ جو جہاں افروز میرے گھر میں رہتی ہے وہ انسان نہیں، چلتی پھرتی لاش ہے۔ ایسی لاش جیسے عزت داروں کا یہ معاشرہ دفن بھی نہ کرنا چاہے گا نہ ہی کوئی اس کا جنازہ پڑھائے گا۔''

''کل ایک چیک تمہارے گھر پہنچ جائے گا جس پر اتنی رقم درج ہوگی جس سے معاشرے میں اس کی باعزت واپسی ہو جائے گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ایسی باتیں لوگ فراموش کر دیتے ہیں۔ میں اس کی پچھلی زندگی کے متعلق تحقیقات کروا چکا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا اس کا ذمہ دار میں ہوں۔ اس کی پچھلی زندگی بالکل بے داغ ہے۔ اسی لیے میں اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔'' سعد نے عالیہ کی جذباتی گفتگو کا جواب انتہائی غیر جذباتی انداز میں دیا۔

''نہیں۔'' عالیہ کے لہجے میں اضطراب تھا ''اسے کوئی چیک یا پیسہ نہیں چاہیے۔ میں نے کہا نا کہ پیسہ اس کی کھوئی ہوئی وہ چیز اس کو واپس نہیں دلا سکتا جس کے کھو جانے نے اسے زندگی سے دور کر دیا ہے۔ تمہارے نزدیک یہ محض تمہاری غلطی تھی میرے نزدیک ایک انسانی قتل ہے جس کے تم مرتکب ہوئے ہو۔''

''میں نے جو کہا ہے اسے میں ضرور پورا کروں گا۔'' سعد نے ایک دم اٹھتے ہوئے کہا۔

''ویسے تم نے جو مجھے ریلیاں نکالنے اور احتجاج کرنے کی دھمکی ابھی دی ہے اس پر شوق سے عمل کر لو۔ تمہارے اس عمل سے شہر کی ایک چیونٹی پر بھی کوئی اثر ہونے والا نہیں۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں کہ جس عزت

کی بات تم کر رہی ہو وہ روزانہ اسی شہر کی گلیوں اور اونچے محلوں میں کیسے کیسے رلتی ہے۔ کیا تم نے کبھی سنا۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ باور نکلنے کے لیے مڑ گیا۔ عالیہ وہیں بیٹھی اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔

''آئی ایم سوری افروز! میں تمہارے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔'' اس نے سوچا اور اپنی نم آنکھوں کو ٹشو پیپر سے صاف کرتی بیگ اٹھا کر باہر نکل آئی۔

''باہر بادل آسمان پر چھائے ہوئے تھے اور ہوا بند تھی، وہ آہستہ قدموں سے چلتی گیٹ تک آئی اور یونہی اس نے مڑ کر پارکنگ لاٹ کی طرف دیکھا۔ سعد ابراہیم اپنی گاڑی کے قریب کھڑا کسی لڑکی سے محو گفتگو تھا۔ آنسوؤں کا ایک اور ریلا اس کی آنکھوں سے نکلا۔ اس نے شکر کیا کہ اس وقت نیم تاریکی تھی اور کوئی اس کو دیکھ نہیں رہا تھا۔

''چیک، پیسہ۔'' گیٹ سے باہر نکل کر طویل سڑک پر چلتے ہوئے اس کا ذہن ایک نئے امکان پر سوچنے کے قابل ہو چکا تھا۔

''پیسے سے گھر خریدا جا سکتا ہے، چند دن تک زندگی کا سامان کیا جا سکتا ہے۔ فوری طور پر اسے سر چھپانے کی جگہ مل جائے۔ چند دن وہ سکون سے کہیں بیٹھ جائے تو شاید کچھ اور سبیل زندگی کے لیے نکل آئے۔'' یہ نیا امکان قابل غور تھا اور اس پر مزید سوچا جا سکتا تھا۔ اب اس کے دل کو کل ملنے والے چیک کا انتظار کرنا تھا۔ وہ انہی سوچوں میں غلطاں بس سٹینڈ کی طرف جا رہی تھی۔ جب بڑھتے ہوئے حبس کا خاتمہ ایک دم تیز چلنے والی ہواؤں سے ہونے لگا۔ ٹپ ٹپ پانی کی موٹی موٹی بوندیں اس کے اوپر گرنے لگیں۔ اسے اس قسم کے موسم کا اندازہ نہیں تھا جب وہ گھر سے نکلی تھی اس وقت تیز دھوپ چھائی ہوئی تھی۔ اس نے سڑک کے ساتھ قطار در قطار لگے درختوں کے سائے کے نیچے چلنا شروع کر دیا۔ اس کے بائیں طرف مختلف گاڑیاں آ جا رہی تھیں۔ جب ہی اچانک ایک گاڑی بالکل اس کے ساتھ آ کر رک گئی۔ اس کا دل کانپ گیا۔

''آؤ، تمہیں میں ڈراپ کر دوں۔'' شیشہ نیچے اتار کر جو شخص اس سے مخاطب ہوا تھا وہ سعد ابراہیم تھا۔

''مجھے تم سے کچھ کہنا بھی ہے، اچھا ہوا کہ تم مجھے یہاں مل گئیں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

''کیا میں اس شخص پر اعتبار کر سکتی ہوں، ہرگز نہیں۔'' اس کے دل نے کہا۔

''شکریہ۔'' وہ آگے چل دی۔ وہ اس کے پیچھے آیا اور ایک مرتبہ پھر اس کے قریب رک گیا۔

''دیکھو، میں نے چند لمحے پہلے فیصلہ کیا ہے، میں تمہاری دوست سے نکاح کے لیے تیار ہوں۔ تم سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ یہ نکاح کب اور کہاں ہو سکتا ہے۔'' بارش اچانک تیز ہونے لگی تھی مگر اب عالیہ چغتائی کو بھیگے جانے سے خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے بارش کے قطرے بھی آسمان سے اترتے ستارے محسوس ہو رہے تھے۔ وہ سچ کہہ رہا تھا، یا اسے بھی گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں تمہاری گاڑی میں بیٹھ کر یہ بات تم سے ڈسکس نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے تمہیں گاڑی سے باہر

آنا پڑے گا یا پھر انتظار کرنا پڑے گا۔'' اس نے بلند آواز میں کہا۔

''ہاں، تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔'' سعد نے ایک منٹ سوچنے کے بعد کہا۔ ''تمہیں میری گاڑی میں بیٹھنے پر تامل ہونا چاہیے۔ چلو میں باہر آجاتا ہوں۔'' اس نے گاڑی ایک سائیڈ پر کھڑی کی اور باہر نکل آیا۔ اس وقت وہ سفید شارٹس اور ریڈ کالر والی سپورٹس شرٹ میں ملبوس تھا۔ پہلی مرتبہ عالیہ نے سوچا کہ وہ یقیناً ایک شاندار شخصیت کا مالک تھا۔ اس نے اپنا بڑا سا دوپٹہ اپنے گرد لپیٹ لیا اور اس کے ساتھ چلتے چلتے گفتگو کرتی بس شاپ تک پہنچ گئی۔ اپنے روٹ کی بس میں بیٹھتے ہوئے اور گھر واپسی تک اس کا ذہن ہلکا پھلکا ہو چکا تھا۔ جو امکان اور جو منصوبہ سب سے زیادہ مشکل تھا اور جس کی کامیابی کے چانسز نہ ہونے کے برابر تھے، وہی اللہ کی رضا قرار پایا تھا۔

☆

جہاں افروز نے اس وسیع سجے سجائے کمرے کے بیچوں بیچ کھڑے ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ یہ کمرہ ڈرائنگ روم تھا، ڈائننگ روم تھا یا ٹی وی لاؤنج وہ فیصلہ نہ کر پائی تھی۔ یہ جو بھی کمرہ تھا جدید سہولیات اور قیمتی سامان سے مزین تھا۔ سعد ابراہیم ابھی آدھ گھنٹہ قبل اسے اس اپارٹمنٹ میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے ساتھ کیے بعد دیگرے جو کچھ ہوا تھا اس سب نے اس کا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ وہ عالیہ چغتائی اور زین چغتائی تھے جنہوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ سعد ابراہیم آکر اس سے نکاح کرنے گا تو وہ سر اٹھا کر جی سکے گی۔ اس پر سے آبرو باختگی کا لیبل اُتر جائے گا اور کیا معلوم کہ اس کاغذ کو دیکھ کر جسے نکاح نامہ کہتے تھے اس کے والدین بھی اسے قبول کر لیں۔

''ہاں یہ ہو سکتا ہے، ہاں وہ ہو سکتا ہے۔'' اس کے ماؤف ذہن نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سوچا تھا۔ مگر اس وقت تک وہ عالیہ کے گھر والوں کے حسن سلوک، سے اس حد تک گھبرا چکی تھی کہ اسے جو بھی کوئی اور جائے پناہ نظر آتی وہاں جانے کو تیار تھی۔

''سعد ابراہیم۔'' اس نام نے اس کے دماغ کو ایک جھٹکا ضرور لگایا تھا اور اس نے عالیہ کے سامنے اپنے دل میں اُگی نفرت کا اظہار بھی کیا تھا۔

''دیکھو جو عزت خراب کرنے کے باعث بنا ہو، وہی عزت کا پاس دار بن جائے تو کیا حرج ہے۔ اس کے پاس ایسا اسٹیٹس ہے جس کی وجہ سے اب تم پر کوئی انگلی نہ اٹھا سکے گا اور میری بہن! سچ پوچھو تو اس وقت اس سارے مسئلے کا یہ ہی واحد حل ایسا ہے جو باقی تمام امکانات پر بھاری ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسے معجزہ قرار دینا غلط نہ ہوگا۔

عالیہ نے اس وقت تک اس کی جو اخلاقی، روحانی، مالی مدد کی تھی اس کا بدلہ وہ تمام عمر بھی چاہتی تو شاید ادا نہ کر سکتی تھی۔ اس کے خلوص کے آگے اب تمام عمر اس کا سر جھکا ہی رہنا تھا، وہ اس کے کسی بھی مشورے

کو غلط قرار نہیں دے سکتی تھی سو اس نے ایک بار کے سوا اس کے کسی عمل پر بھی احتجاج نہیں کیا تھا۔ زین نے ایک چھوٹے سے بینکویٹ ہال میں نکاح کے لیے سعد ابراہیم کو آنے کو کہا تھا۔ سعد کے ساتھ اس کے تین دوست تھے۔ زین اور اس کا ایک دوست جہاں افروز کے ولی بنے تھے اور یوں یہ نکاح ہو گیا تھا۔ نکاح کے بعد سعد ابراہیم اسے اپنی گاڑی میں بٹھا کے اس اپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔

''یہ اپارٹمنٹ میں نے پچھلے ہفتے خریدا ہے اور اس کی فرنشنگ کل مکمل ہوئی ہے۔ یہ گھر میں نے تمہارے نام سے خریدا ہے۔ تمہارے لیے اکاؤنٹ اس بینک میں کھل چکا ہے۔'' اس نے چند کاغذات اور کریڈٹ کارڈ اس کے سامنے رکھے۔ ''نکاح نامے کی ایک کاپی تمہارے پاس رہے گی۔ میرا مشورہ البتہ یہ ہے کہ کچھ دن تم یہاں سے باہر مت نکلو۔ فریج اور فریزر کھانے کی چیزوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ کچن میں کھانے کا سب سامان موجود ہے اور میرے اندازے کے مطابق ضرورت کی باقی تقریباً تمام چیزیں اس چھت کے نیچے میسر ہیں۔ فکسڈ فون لائن کا انتظام ایک آدھ دن میں ہو جائے گا، یہ موبائل اور یہ سم کارڈ بھی تمہارے لیے ہے۔'' اس نے ایک چھوٹا سا شاپر اس کے سامنے رکھا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے وہ تمام چیزیں مہیا کرنے کی کوشش کی ہے جن کی تمہیں ضرورت ہو سکتی ہے۔ یہ میرا انتہائی پرسنل نمبر ہے۔ کوئی مسئلہ پھر بھی درپیش ہوا تو رنگ کر لینا، میں اب چلتا ہوں۔ دروازے میں ڈبل لاک سسٹم موجود ہے۔ اگر کوئی بیل ہو بھی تو مجک آئی سے چیک کیے بغیر دروازہ مت کھولنا۔''

جہاں افروز نے یہ ساری تقریر، یہ ساری ہدایات اور معلومات یونہی کھڑے کھڑے سنی تھیں اور ابھی وہ انہیں سمجھنے کی کوشش میں ہی مصروف تھی جب اسے محسوس ہوا کہ جانے والا تو جا چکا تھا۔

''اپنی چھت۔'' کچھ دیر بعد اس آرام دہ صوفے پر بیٹھ کر اس نے میز پر دھرے اس اپارٹمنٹ کے کاغذات اٹھا کر دیکھے ''روپیہ'' اس نے کریڈٹ کارڈ اٹھایا ''اور سہولتیں'' موبائل فون کو گھماتے ہوئے اس نے سوچا۔ ''کیا یہ زندگی ہے۔'' اس نے خود سے سوال کیا ''کیا صرف یہ ہی زندگی ہے۔'' اس وقت اس کا ذہن اسے اس سوال کا جواب نہیں دے پا رہا تھا۔ وہ یونہی صوفے پر بیٹھی رہی۔ اس کی نظروں کے سامنے کئی مناظر گھوم رہے تھے۔

جہاں افروز ایک چھوٹی سی بچی، گھر بھر کی لاڈلی، سب سے چھوٹی اس کی پیدائش کے بعد ابا کے بقول گھر میں خوشحالی آئی تھی۔ انہیں پروموشن ملی تھی اور انہوں نے مسلم ٹاؤن میں پلاٹ خریدا تھا۔ پھر وہ سکول جانے لگی۔ اس کی ٹیچر نے بتایا اس کی ڈرائنگ بہت اچھی تھی۔ اس کی سکول رپورٹس اے ون ہوتی تھیں۔ ہر پروگریس پر اسے گھر بھر سے، امی ابو سے، بھائیوں بہنوں سے، سب سے انعام ملتے تھے۔ اس کی ڈرائنگ، کلرز کا استعمال وقت کے ساتھ اچھا اور اچھا ہوتا گیا۔ ایف اے میں اس نے فائن آرٹس پڑھی اسی مضمون کے ساتھ گریجویشن کی۔ ان ہی دنوں اس کی منگنی ہو گئی۔ لڑکا پڑھا لکھا اور بہت ہی اچھی جاب پر

تھا۔ سسرال والے اس کے حسن سیرت اور ذہانت کے مداح تھے۔ اس کے والد کی ریٹائرمنٹ قریب تھی۔ انہوں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد گریجویٹی اور دوسرے فنڈز سے کچھ پیسہ اسے دیں گے، تاکہ وہ اچھی طرح سے فائن آرٹس کا شوق پورا کر سکے۔ بڑے بھائی بھی اچھی جابز پر لگ چکے تھے۔ دونوں بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ ایک سادہ سی مگر پرسکون زندگی تھی ان سب کی۔ مگر زندگی صرف چھاؤں کا نام تو نہیں، دھوپ بھی اس کا حصہ ہے اسے اپنی دادی بیوی کی نجانے کب کی کہی بات اچانک یاد آ گئی۔

دادی بیوی زندگی کے اس ڈرامے کا یہ کردار تو ذہن سے ہوا ہی ہو گیا تھا۔'' اس نے سوچا۔

سفید جھک بالوں کے چھوٹے سے جوڑے، چھوٹے سے قد اور فیل پا کی وجہ سے بدقت چلتی پھرتی دادی بیوی۔ جو اس وقت فوت ہوئیں جب ابھی وہ سیکنڈ ایئر میں پڑھ رہی تھی۔ دادی بیوی جو زیادہ چلنے پھرنے سے معذور تھیں اور اکثر جائے نماز والی چوکی پر بیٹھی رہتی تھیں۔ وہ ہر وقت باوضو رہتی تھیں۔ واش روم جاتیں تو واپسی پر وضو کر کے نکلتیں اور آ کر اپنی مخصوص چوکی پر بیٹھ جاتیں۔ اپنے سامنے بیٹھے کسی بھی شخص سے محو گفتگو ہوتیں اور فرض نمازوں یا نفلی نمازوں کا وقت ہو جانے پر قبلہ رو ہو کر بیٹھے بیٹھے ہی خدا کے حضور حاضر ہو جاتیں۔ ان کے ہاتھ میں ہمہ وقت تسبیح ہزار دانہ پکڑی رہتی جس کے ہر دانے پر نجانے کیا کچھ پڑھتی تھیں۔ اور یہ بھی تو اچنبھے کی بات تھی نا کہ اس نئی جگہ کے وحشت ناک سناٹے اور تنہائی میں اتنے عرصے بعد اسے اچانک دادی بیوی یاد آنے لگی تھیں۔

''سخت پریشانی کے عالم میں جب کوئی راستہ نہ سوجھ رہا ہو، اور اگر اس وقت پیٹ بھی خالی ہو تو سب سے پہلے پیٹ کی بھوک مٹانے کا کوئی انتظام کرنا چاہیے۔ پیٹ میں کچھ ہوگا تو دماغ کچھ اچھا سوچنے کے قابل ہو گا نا۔'' اسے ان کی کہی ایک اور بات یاد آئی اور پھر اسے شدت سے بھوک کا احساس بھی ہوا۔ اس نے اندازے سے سوئچ تلاش کیا اور بٹن دبا دیا۔ چھت کے وسط میں ٹنگے فانوس کی ان گنت روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ اس نے ادھر ادھر جائزہ لیا۔ سامنے کے لمبے لمبے دریچوں پر بھاری پردے پڑے تھے اور غالباً تین ٹن کا اے سی کمرے کو خاصا خنک کر چکا تھا۔ اس نے اس سمت کا رخ کیا جہاں ڈائننگ ٹیبل سجی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک دروازہ تھا۔ وہ اس دروازے سے اندر داخل ہوئی اور دروازے کے ساتھ نظر آنے والے سوئچ بورڈ کے سارے سوئچ دبا دیئے۔ یہ کمرہ بھی روشن ہو گیا۔ یہ کچن تھا۔ امریکن سٹائل کچن کی ضرورت کی تمام چیزوں سے سجا تھا اس کمرے میں تازہ روغن اور لکڑی کی بو پھیلی ہوئی تھی اس کی فنشنگ غالباً کل ہی مکمل ہوئی تھی۔ اس کچن کے ایک سائیڈ پر پڑا فریزر گھرر گھرر کی آواز دے رہا تھا، اور اس کے ساتھ ہی ایک فل سائز فریج بھی تھا۔ اس نے فریزر کا شیشہ ہٹایا۔ وہ ٹن بند کھانوں اور فوائل میں لپٹے اسنیکس سے اٹا پڑا تھا۔ فریج میں جوسز تھے اور منرل واٹر کی بوتلیں۔ اس نے کچھ پکے ہوئے کھانے کے پیک نکالے اور مائیکرو اوون کی طرف بڑھی۔ اس

نے ٹائم سیٹ کیا اور اسے آن کر دیا۔ وہ یہ سب یوں کر رہی تھی جیسے یہ اس کا معمول ہو۔ اسے نہ گھبراہٹ ہو رہی تھی نہ ہی خوف آ رہا تھا۔ کھانا اور سپرائٹ کا ٹن لے کر وہ اس بڑے کمرے میں آ گئی۔ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر اس نے سکون سے وہ کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد واپس کچن میں آئی تو اسے الیکٹرک کیتل نظر آئی۔ اس نے سارے کیبنٹس کھول کر دیکھے۔ وہ دالوں، مسالوں اور ضرورت کے برتنوں سے سجے تھے۔ اس نے ٹی بیگز کا ڈبہ اور ٹی وائٹنر کا پیک نکالا اور اپنے لیے چائے بنائی۔ اسے نہ تنہائی نے کاٹا نہ سناٹے نے ڈرایا۔ جو کچھ اس نے عالیہ کے گھر میں بھگتا تھا فی الحال وہ اس سے نجات پر مطمئن تھی۔ آگے کی سوچنے کے لیے رات پڑی تھی۔ ایک نہیں کئی طویل راتیں۔

☆

جہاں افروز اس طویل رات کو ایک منٹ کے لیے سو نہ سکی تھی۔ پیٹ کی بھوک مٹ چکی تھی اور چائے کے مگ نے اس کی تمام حسیات کو جگا دیا تھا۔ پھر اسے اس روز کا واقعہ یاد آیا جب وہ ٹیکسی والا مسلم ٹاؤن کے بجائے کہیں اور لے جا رہا تھا۔ وہ شور مچا رہی تھی، احتجاج کر رہی تھی۔ مگر اس نے فل والیوم میں ریڈیو آن کیا ہوا تھا اور ٹیکسی کے دروازے لاکڈ تھے، اس کے شیشے بھی بند تھے۔ اردگرد بھاگتی ٹریفک اور پیدل چلنے والوں میں سے ایک نے بھی اس کے واویلے کا نوٹس نہیں لیا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کھلے تھے، مگر ٹیکسی کا سارا کنٹرول ڈرائیور کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ٹیکسی ایک کم آباد رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی اور رہائشی اپارٹمنٹس کے باہر جا رکی۔ یہاں کوئی بھی نہیں تھا ماسوائے ایک چوکیدار اور ایک آدمی کے، ان دونوں نے مل کر اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا تھا اور اسے بازوؤں میں اٹھا کر سیڑھیوں سے اوپر لے گئے تھے۔ شاید یہ فلیٹس اتنے نئے تھے کہ ابھی اس کا کوئی بھی اپارٹمنٹ آباد نہیں ہوا تھا۔ یہ ایک مختصر اپارٹمنٹ تھا جہاں بہت کم سامان موجود تھا۔ وہ دونوں اسے وہاں چھوڑ کر باہر نکلنے لگے تھے۔ وہ ان کے پیچھے بھاگی تھی۔ مگر وہ دروازہ باہر سے لاک کر چکے تھے۔ اس نے اس کمرے کی ساری کھڑکیاں دیکھیں وہ کمرہ نجانے کونسی منزل پر تھا کیونکہ زمین اسے دور بہت دور نظر آئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کیوں ہوا۔ اس کی اس کے گھر کے کسی بھی فرد کی کسی سے ایسی دشمنی نہیں تھی جس کے نتیجے میں اس کے ساتھ ایسا کیا جاتا۔ اس کا بیگ اور کتابیں ٹیکسی ہی میں رہ گئی تھیں۔ وہ لرزتی کانپتی آنسو بہاتی صوفے پر پاؤں رکھے بیٹھی رہی۔ کافی دیر بعد بیرونی دروازے کھلنے کی آواز آئی۔ اس نے سہم کر مزید سمٹتے ہوئے خوفزدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ اندر آنے والا اپنے ساتھ کیا لا رہا تھا رہائی اور امید یا رسوائی اور ناامیدی۔ اس نے دیکھا وہ ایک خوش رو لڑکا تھا جو خوش لباس بھی تھا مگر اس کا انداز عجیب سا تھا بہت ہی عجیب۔

''تم یہاں کیوں بیٹھی ہو اور اس حلیے میں۔'' اس نے لائٹ جلا کر اس سے یوں پوچھا تھا۔ جیسے وہ اسے پہلے سے جانتا ہو اور اس کی یہاں موجودگی اس کے لیے متوقع تھی۔ جواب میں افروز کے منہ سے ایک

بھی لفظ نہیں نکلا تھا وہ ہاتھ جوڑ کر منمنا رہی تھی اور اپنے کانپتے وجود پر قابو پانے میں ناکام ہوئے جا رہی تھی۔

''اوہ۔'' وہ مسکرایا۔ ''لگتا ہے سعید تمہیں زبردستی پکڑ لایا۔'' وہ ایک دیوار گیر الماری کی جانب بڑھتے ہوئے بولا۔ اس نے اس الماری کو نجانے کس طرح کھولا تھا کیونکہ اس میں کوئی ہینڈل موجود نہ تھا۔ ''میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں اور یہ کوئی اچھی بات بھی نہیں ہے۔'' وہ الماری میں رکھی ڈھیروں بوتلوں کو چیک کرتے ہوئے بولا اور پھر اس نے ایک خوبصورت شکل کی بوتل اٹھائی ''مگر تم کیوں گھبرا رہی ہو۔'' پھر وہ واپس آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کم آن یار! یہ تمہارے لیے کوئی نئی بات تو نہیں اور تمہیں اس کی قیمت ادا کی جائے گی اس کی تم پروا مت کرو۔''

اس نے شیشے کے ایک لمبے گلاس میں بوتل کا محلول انڈیلتے ہوئے کہا۔

''دیکھو میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ تمہیں غلط فہمی ہو رہی ہے۔'' آخر کار الفاظ جہاں افروز کے منہ سے نکل ہی آئے تھے۔

''غلط فہمی۔'' اس نے ایک گلاس پینے کے بعد دوسری مرتبہ وہ محلول اس میں انڈیلا ''سعید اکبر اور غلط فہمی، بہت چالاک ہو تم اور تمہیں ہونا بھی چاہیے تمہارا کام یہ ہی تو ہے۔''

''خدا کے واسطے، اللہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے واسطے۔'' افروز نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کانپتے ہوئے بار بار یہ الفاظ دُہرائے، مگر تیسرا گلاس چڑھانے کے بعد اس پر غالباً ہوش کے دروازے بند ہو گئے تھے اور وہ اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔

''میں سعد ابراہیم ہوں، یہ دیکھو یہ میرا کارڈ ہے۔'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سامنے اسے سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ ''شاید مجھ سے واقف نہیں ہو، مگر دیکھنا میں ایک لمبی مدت کا اچھا دوست ثابت ہوں گا۔'' اس کی دست درازی کے ساتھ ساتھ اس کے منہ سے نکلنے والے بے ربط الفاظ کا سلسلہ بھی جاری تھا۔

''خدا کے لیے، خدا کے واسطے۔'' وہ ادھر اُدھر بھاگ رہی تھی۔

''یہ انوکھی ادائیں ہیں، میں نے ان کے بارے میں پہلے نہیں سنا تھا۔'' اس نے اس پر قابو پانے کی کوشش میں تھک کر صوفے پر گرتے ہوئے کہا اور ایک اور گلاس چڑھا لیا اب اس کے ارادے اور عمل میں لڑکھڑاہٹ نہیں رہی تھی۔ اس نے ایک جست لگا کر کونے میں سہمی افروز کو پکڑا تھا اور گھسیٹتے ہوئے بیڈ روم میں لے آیا تھا۔ اس کے بعد شیطان کا راج ہو گیا تھا۔

☆

رات کا اندھیرا چھٹ گیا تھا اور صبح کی روشنی چہار سو پھیل گئی تھی۔ شاید اسی روشنی کے ساتھ وہ بھی ہوش میں آ گیا تھا۔ جب ہی ساکت پڑی افروز نے دیکھا، وہ منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے کے بعد سرعت

سے اس کمرے سے نکلا اور باہر چلا گیا تھا۔ جاتے ہوئے اس نے غالباً بیرونی دروازہ بھی بند نہیں کیا تھا وہ اسے کھلا چھوڑ گیا تھا۔ کتنا ہی وقت گزر گیا۔ اس قبرستانوں جیسی خاموشی والی جگہ پر کوئی ذی روح نہیں آیا۔

''میں زندہ ہوں۔'' افروز نے ساکت پڑے پڑے خود سے سوال کیا۔ ''یا مر چکی ہوں۔'' پھر اس نے اپنے جسم کو حرکت دی اور اسے حیرت ہوئی کہ وہ زندہ تھی۔ اس کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے اس کی کلائیوں میں چبھے تو اسے مزید آگاہی ہوئی، وہ محسوس کر سکتی تھی یقیناً وہ مری نہیں تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے۔ وہ موت کی آرزو کر رہی تھی کیا اسے مرنہیں جانا چاہیے تھا۔ پھر اس کے دل پر ہیبت چھا گئی۔ کیا مرنا اور مرنے کی خواہش کرنا اتنا آسان تھا۔ اس کا دل کانپنے لگا۔ اسی دم اچانک کہیں سے دو آدمی یوں دندناتے اندر آئے، جیسے اس طرح کی اموات پر لاشیں اٹھانا ان کا روز کا کام ہے۔ انہوں نے چادر میں لپٹی افروز کو اٹھا کر بٹھایا۔

''جلدی کرو بی بی اپنے کپڑے درست کرو۔'' وہ میکانکی انداز میں کہہ رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد وہ اسے یوں ہی گھسیٹتے نیچے لا رہے تھے۔ انہوں نے اسے رکشا میں بٹھا دیا تھا۔ اردگرد کے مناظر تیزی سے افروز کی پتھرائی نظروں کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ پھر رکشہ نے موڑ موڑا۔ اس کے گھر کے سامنے رک گیا۔ وہ گھر جس نے ہمیشہ اسے تحفظ، پناہ سکھ اور خوشی دی تھی اور کھلی بانہوں اسے اپنے آپ میں سمیٹا تھا۔ اس کی زندہ لاش تیزی سے متحرک ہوئی اور وہ اس کا دروازہ کھول کر بھاگتی ہوئی گیٹ تک پہنچ گئی۔ اس نے بے قراری سے گیٹ کھٹکھٹایا تھا۔ وہ مانوس چہروں کو دیکھنے کے لیے بے چین تھی جنہوں نے اس کے زخموں پر مرہم رکھنا تھا اور اس کے اشکوں کو پونچھنا تھا۔ وہ جنہوں نے اس کے چور چور جسم کو اپنی بانہوں میں سمیٹنا تھا۔ مگر وہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ اسے لعن طعن کیا جا رہا تھا۔ اسے دھکے دے کر باہر نکالا جا رہا تھا۔ وہ نفرت بھری نظریں دیکھ رہی تھی۔ شعلہ بار نظریں، غصے سے سفید پڑتے چہرے۔ شاید وہ کسی غلط جگہ گئی تھی۔ مگر وہ سب وہی تھے وہ سب اس کا باپ، اس کی ماں، اس کے بہن بھائی، چچا، ماموں، خالہ، پھوپھیاں، کزنز کون نہیں تھا، مگر وہ سب اس کی دسترس سے دور ہوئے چلے جا رہے تھے۔

''تم ہمارے لیے، ہم تمہارے لیے مر گئے، ہمارا تم سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔'' اس نے سنا اس کا باپ کہہ رہا تھا۔ پھر وہ سیاہ آہنی گیٹ بند ہو گیا۔ وہ سب گیٹ کے اس پار اور وہ اس پار کھڑی رہ گئی۔ مانوس چہرے اجنبی ہو گئے اور وہ زخم زخم سامنے کے منظر پر یقین کرنے کی کوشش میں لگی تھی۔ اس لق و دق صحرا میں تنہا کھڑے کھڑے اسے کتنی دیر ہو چکی تھی اسے احساس نہیں ہوا۔ پھر اس کے شانے پر کسی نے ہاتھ دھرا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کی دو سالہ پرانی دوست عالیہ چفتائی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

''تم کہاں کھو گی تھیں جہاں افروز! میں نے تمہیں کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''ہاں۔'' اسے یاد آنے لگا۔ یہ ابھی گزرے کل ہی کی تو بات تھی جب عالیہ کے جلدی گھر چلے جانے

اور روٹ وین مس ہو جانے پر وہ پریشان تھی اور پھر دیر ہو جانے کے خیال سے اس نے وہ ٹیکسی روک لی تھی۔ پھر اس کے بعد کیا ہوا تھا اور اس کے بعد، پھر اس کے بعد اسے ایک ایک منظر یاد آنے لگا۔ اس کا جسم کٹی شاخ کی طرح جھولنے لگا تھا اور وہ بے ہوش ہو کر عالیہ چغتائی کی بانہوں میں گر گئی تھی۔

کس طرح عالیہ چغتائی اسے اپنے گھر لے کر آئی تھی۔ کس طرح اس نے اپنے گھر والوں کو کوئی کہانی سنائی تھی۔ اور پھر وہ کہاں کہاں اس کی خاطر خوار ہوتی رہی تھی۔ جہاں افروز کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ حالانکہ وہ روزانہ واپس گھر واپس آ کر اسے اپنی دن بھر کی کہانی ضرور سناتی تھی۔ افروز کے والدین، اس کے بہن بھائی، بہنوئی، منگیتر، سعد ابراہیم، انجی مسعود اس نے کس کس کا دروازہ نہیں کھٹکھٹایا تھا۔ اسے ہر در سے لوٹا دیا جاتا تھا۔

''تم ایسا کرو عالیہ! مجھے کہیں سے زہر لا دو۔'' اس نے بار بار عالیہ سے کہا تھا۔ عالیہ دن بھر گھر سے غائب رہتی اور افروز بے جان پڑی عالیہ کے گھر والوں کی نت نئی باتیں سنتی۔

''فی الحال اور کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا سوائے اس کے کہ تمہیں ''سائبان'' چھوڑ آیا جائے، میں بے حد شرمندہ ہوں افروز! میرے گھر والوں نے میرا ساتھ دینے سے انکار نہ کر دیا ہوتا تو میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں اپنے گھر میں رکھ لیتی۔ مگر مجھے امید ہے کہ جلد ہی مصیبت اور پریشانی کے دن ختم ہو جائیں گے اور کوئی راستہ نکل آئے گا۔'' ایک روز اس نے کہا تھا، مگر اس سے اگلی شام ہی وہ بتا رہی تھی کہ وہ خود اور اس کا بھائی زین اس کا نکاح سعد ابراہیم سے کرنے جا رہے تھے۔ کیا ہو رہا تھا کیا نہیں ہو رہا تھا، کیا ہو سکتا تھا، کیا نہیں ہو سکتا تھا، جہاں افروز کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں گم ہو چکی تھیں۔ وہ صرف سنتی تھی اور جیسا اسے کہا جاتا تھا ویسے کرتی جاتی تھی۔ خصوصاً جو عالیہ اسے کرنے کو کہتی تھی۔ مگر سعد ابراہیم سے نکاح، وہ چونک گئی تھی وہ شخص جس نے میری زندگی برباد کر کے رکھ دی۔ میں روشنی میں جیتی تھی، مجھے موت کے اندھیروں میں دھکیلنے والا وہ شخص پھر عالیہ نے اپنے دلائل پیش کرنے میں پوری رات صرف کر دی۔ اس نے صبح کی روشنی پھیلنے تک اسے قائل کر لیا تھا۔ اس حد تک کہ اسے یقین ہو گیا تھا کہ سعد ابراہیم کا اس سے نکاح پر مان جانا معجزہ تھا اور یقیناً خدائی مدد بھی تھی اور اس سارے ہنگامے کے نتیجے میں اس رات وہ ایک نئی چھت کے نیچے ایک نئی حیثیت سے موجود تھی۔

☆

''یہ نکاح نامے کی کاپی ہے اور یہ تمہارا نیا شناختی کارڈ۔''

ایک ہفتے کے بعد سعد ابراہیم ادھر آیا تھا اور اس نے آتے ہی میکانکی انداز میں اسے بتانا شروع کیا۔

''شناختی کارڈ''۔ جہاں افروز کا دماغ اس ایک ہفتے میں اس قابل ہو چکا تھا اچھی بری باتیں سوچنے لگے۔

''یہ کوئی حیران ہونے والی بات نہیں ہے۔'' سعد نے اس کی حیرت کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کے تو سنا ہے لوازمات ہی کافی ہوتے ہیں۔'' یہ بات جہاں افروز نے صرف سوچی تھی۔ اس کی نظریں شناختی کارڈ پر لکھی تھیں۔ جہاں افروز زوجہ سعد ابراہیم وہ پچھلے ایک ہفتے کے دوران اس نئی شناخت پر کتنا رو چکی تھی یہ صرف وہی جانتی تھی۔ اس کا باپ ایک شریف ایماندار شخص تھا، اس کے بھائیوں نے اس کی نیک فطرت ماں کے ہاتھوں پرورش پائی تھی اور لوگ ان کے کردار و اطوار کے گواہ تھے۔ اس کے باپ نے اپنی بیٹیوں کے لیے بھلے متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والے مگر انتہائی شریف اور ایماندار شوہر ڈھونڈے تھے۔ جہاں افروز کے لیے بھی ایسے ہی لڑکے کا انتخاب کیا گیا تھا۔ مگر وہ جہاں افروز کی قسمت کا لکھا بدل نہیں سکتے تھے۔ جہاں افروز کی قسمت میں سعد ابراہیم کی زوجہ ہونا لکھا تھا۔ سعد ابراہیم جو شرابی تھا اور زانی بھی، جو ایک کرپٹ بیوروکریٹ کا بیٹا تھا اور رشوت کے مال پر پلتا رہا تھا۔ گرم گرم آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے بہہ نکلے تھے۔

''کل سراج دین نامی ایک شخص آئے گا اور تمہیں ڈاکٹر فوزیہ لطیف کے کلینک پر لے جائے گا۔ وہاں یہ معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری مظلومیت کا جو یہ پہلو مجھے بتایا گیا تھا اس میں کتنی صداقت ہے اور اس کے سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔'' وہ مزید بولا تھا۔

''ڈاکٹر فوزیہ لطیف۔'' افروز کے کانوں نے سنا اور ذہن نے کچھ یاد کیا۔ کچھ عرصہ پہلے ہی ناجائز کاموں کے سلسلے میں جن ڈاکٹرز پر ایک رپورٹ اخبار میں شائع ہوئی تھی ان میں ڈاکٹر فوزیہ لطیف کا نام سرفہرست تھا۔ اس کا دل کانپ گیا۔

''تم تم اپنی اس دوست، کیا نام ہے اس کا۔'' اس نے آخری بات کی۔ ''عالیہ چغتائی اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھو گی۔''

افروز نے پہلی مرتبہ ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا تھا۔ ''اس کو کچھ بھی سمجھ لو، درخواست، حکم یا دھمکی، بہرحال تم اس سے رابطہ نہیں رکھو گی کسی بھی قسم کا۔'' وہ اس کے چونکنے کی پروا کیے بغیر بولا تھا۔ پھر اس نے اٹھ کر سارے کمرے چیک کیے تھے۔ لائٹس، پردے، کھڑکیاں۔

''بے ترتیبی ہے اور صفائی بھی نہیں ہوئی، لگتا ہے تمہیں ماتم کرنے کے سوا کچھ اور آتا ہی نہیں ہے۔ تمہارے ان آنسوؤں کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی وہ سب تو ہو گیا جو تمہاری ڈیمانڈ تھی۔ اب رونا کیسا؟'' وہ سب کچھ چیک کرنے کے بعد واپس اس کے سامنے آتے ہوئے بولا۔ اس کے ہاتھ میں موبائل تھا جو پچھلی مرتبہ وہ اسے دے کر گیا تھا۔

''عالیہ چغتائی، عالیہ چغتائی، عالیہ چغتائی۔'' اس نے ریسیوڈ اور ڈائلڈ کالز چیک کرتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ ''اس نام اور اس نمبر کو ڈیلیٹ کر دو، اس لڑکی سے اب تمہارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔'' اس نے موبائل ایک طرف اچھال کر سخت لہجے میں کہا۔

''تمہارے کھانے پینے کا سامان کم ہو رہا ہے، کل وہ بھی پہنچ جائے گا اور کچھ؟'' وہ واپس جانے کے لیے مڑا اور باہر نکلنے سے پہلے بولا تھا۔ افروز نے ہونٹ بھینچ رکھے تھے اور اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ منہ کھولنے کی کوشش کرے گی بھی تو اس کے منہ سے صرف چیخیں نکلیں گی۔

''ٹھیک ہے پھر میں چلتا ہوں، اندر سے دروازہ لاک کر لو۔'' وہ لمبے قدم اٹھاتا باہر نکل گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد افروز نے سرعت سے اٹھ کر دروازہ لاک کر دیا تھا۔ اسی وقت اسے موبائل کی بیپ سنائی دی تھی۔ اس نے وحشت کے عالم میں موبائل تلاش کیا۔ وہ صوفے کے پیچھے قالین پر گرا پڑا تھا۔ اس کی سکرین پر وہ نام روشن تھا۔ عالیہ چغتائی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل آن کیا۔

''ہیلو، عالیہ!'' اس کی آواز بھی کانپ رہی تھی'' وہ کہہ کر گیا ہے کہ میں تم سے کوئی رابطہ نہ رکھوں، وہ کہتا ہے کہ تم سے دوستی ختم کر لوں، وہ، وہ، وہ۔'' اسے اپنی آواز کسی پاتال سے آتی محسوس ہو رہی تھی اور پھر شاید وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

☆

سعد کی گاڑی جم خانہ کلب کی طرف جا رہی تھی، جب اس کا موبائل بجنے لگا۔ اسے گاڑی ڈرائیو کرتے وقت فون سننے سے سخت چڑ تھی۔ اس لیے اس نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔ مگر موبائل وقفے وقفے سے بجتا ہی چلا جا رہا تھا۔ تنگ آ کر اس نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر کسی کے نام کی بجائے صرف نمبر تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ یہ نمبر اس کی نظروں سے پہلے بھی کہیں گزرا تھا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگا لیا۔

''سعید ابراہیم! تم جہاں کہیں بھی ہو پلیز جہاں افروز کو جا کر دیکھو، مجھے لگتا ہے اس کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے۔'' اس کے ہیلو کہتے ہی ایک نسوانی آواز نے اسے کہا تھا۔

''تم کون ہو؟'' جہاں افروز والی بات سے کون اس طرح واقف ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے یہ بات سخت شاک کا باعث تھی۔

''میں عالیہ ہوں، عالیہ چغتائی میں اس وقت اس اپارٹمنٹ کے دروازے پر کھڑی ہوں مگر میری بیل کا کوئی جواب نہیں دے رہی وہ، تمہارے پاس تو یقیناً اس کی چابی موجود ہو گی، پلیز تم فوراً آ جاؤ۔''

سعد کی جان میں جان آئی۔ اس نے موبائل بند کر کے گاڑی موڑ لی۔ آدھے گھنٹے کے بعد وہ وہاں پہنچا تھا۔ عالیہ چغتائی اسی سراسیمگی کی حالت میں وہاں کھڑی تھی۔

''میں ابھی اس کو یہاں ٹھیک ٹھاک چھوڑ کر گیا تھا جیتا جاگتا۔ تم یہاں کب آئیں اور تمہیں کیسے علم ہوا کہ اس کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے؟'' وہ لاک کھولتے ہوئے طیش کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ عالیہ نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ اندر داخل ہونے کے لیے بے چین تھی۔ وہ دونوں ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔

جہاں افروز صوفے کے پیچھے نیچے گری پڑی تھی۔ اس کا موبائل اس کے ہاتھ کے پاس پڑا تھا۔

''افروز، افروز پلیز۔'' عالیہ نے اسے جھنجھوڑا تھا مگر وہ یونہی ساکت پڑی رہی تھی۔

''یہ زندہ ہے نا؟'' اس نے بے چارگی کے عالم میں سعد سے پوچھا تھا جس کی انگلیاں اس کی نبض ٹٹول رہی تھیں۔ ایک گہرا سانس لیتے ہوئے اس نے افروز کو اٹھا کر صوفے پر ڈالا تھا۔

''ادھر کچن سے پانی کا گلاس لے کر آؤ۔'' اس نے کچن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اس کے چہرے پر پانی کے چھینٹے اور چہرہ ہلکے سے تھپتھپایا۔

''یہ ہوش میں آ رہی ہے۔ ذرا بہتر ہوتی ہے تو اسے کسی طرح نیچے لے آؤ۔ میں نیچے گاڑی میں بیٹھا ہوں، میرا خیال ہے کہ اسے کسی ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے۔'' اس نے گلاس میز پر رکھتے ہوئے عالیہ سے کہا اور باہر نکل گیا۔ عالیہ نے ہوش میں آتی لڑکھڑاتی افروز کو بمشکل کھڑا کیا اور اسے سہارا دے کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی باہر لے آئی۔ دروازے کے کی ہول میں چابیوں کا گچھا لٹک رہا تھا۔ اس نے دروازہ لاک کیا اور لفٹ کے اوپر آنے کا انتظار کرنے لگی۔

☆

''میرا خیال ہے کہ تم بہتر ہو اب پہلے سے بہت بہتر۔'' سعد ابراہیم نے بیڈ پر بیٹھی افروز کو مخاطب کیا۔ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھی تھی اور اس کی ٹانگوں پر کمبل پڑا تھا۔ اس کا چہرہ قدرے فریش لگ رہا تھا اور بال بھی سلجھے ہوئے تھے۔

''دیکھو میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر فوزیہ لطیف کی مدد سے اس پریگننسی سے نجات حاصل کر لی جائے۔ یہ مجھ سے زیادہ تمہارے فائدے کی بات تھی۔ تم ایک مصیبت میں پڑ جاؤ گی بچہ پیدا کر کے۔ میرا اس میں نقصان اس لیے نہیں ہے کہ مرد کے لیے مکرنا مشکل نہیں ہوتا۔ مگر یہ تمہاری ضد ہے، اس کا نتیجہ بھی تمہیں ہی بھگتنا ہے۔ عالیہ سے ملنے کے لیے میں نے تمہیں اس لیے منع کیا تھا کہ عالیہ کتنی ہی مخلص دوست ہو اس کی دوستی میرے لیے مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔ اس نے کل تک تمہارے لیے بہت سے راستے ڈھونڈنے کی کوشش کی، کل کو اور بہت سے ڈھونڈے گی۔ یہ مجھے گوارا نہیں ہوگا۔ میں نے اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے جو کچھ کیا ہے میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اب میں مزید اسے کسی اور رنگ میں نہیں بھگتوں گا۔ میں نے سنا ہے کہ تم ایک اچھی سچی مسلمان لڑکی ہو، نماز روزے کی پابند، گناہ ثواب سب کی تفصیل جانتی ہو۔ پھر اگر کبھی اس ماتم اور رونے دھونے سے فرصت ملے تو یہ بھی سوچنا کہ اگر میں تم سے یہ نکاح نہ کرتا تو پھر بھی تمہیں اسی معاشرے میں رہتے ہوئے اسی معاشرے کا سامنا کرنا تھا۔ کبھی غور کرنا کہ اس صورتحال میں کتنا اور کیا فرق ہوتا۔ میں نے اگر گناہ کیا تھا تو مجھے تو سزا ملنا ہی تھی، اس دنیا میں یا اگلی دنیا میں تمہاری بددعائیں میرے ساتھ رہتیں۔ مگر تمہارا کیا حال ہو سکتا تھا اس دنیا میں کبھی ضرور سوچنا۔ وہ جو نہیں ہونا چاہیے تھا پر ٹین کرتے رہنے کے بجائے ہو ہوا اس

پر ضرور غور کرنا۔ پھر شاید تمہاری بات بات پر بے ہوش ہو جانے کی عادت ختم ہو جائے۔''

''وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔'' اس کے جانے کے بعد افروز کو خیال آیا، وہ پندرہ دن ایک پرائیویٹ ہسپتال میں ایڈمٹ رہنے کے بعد واپس آئی تھی۔ سعد کے سامنے اس کی پریگننسی..... کی تصدیق ہو گئی تھی۔ اور ڈاکٹر نے اسے انتہائی کمزور دل کی مریضہ قرار دیا تھا۔ اس کا بہترین علاج ہوا تھا اور سعد نے اس کی یہ ضد بھی مان لی تھی کہ وہ بچہ ضائع نہیں کروائے گی۔ شاید اس میں ڈاکٹر کے اس خدشے کا بھی عمل دخل تھا کہ جس قدر وہ کمزور ہے ایسی کوئی کوشش اس کی جان بھی لے سکتی تھی۔

اس شام اس سارے عرصے میں پہلی بار اس نے اس سارے واقعے کی منفی کے بجائے مثبت پہلوؤں پر غور کیا تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا، اسے پڑھی سنی کئی ایسی مثالیں یاد آنے لگیں جن میں ایسے واقعات کے بعد لڑکیوں کی رسوائی، والدین اور معاشرے کے رویوں اور زندگیوں کی مکمل بربادی کی داستانیں رقم ہوتی تھیں۔ پھر وہ لڑکیاں جو اس ماڈرن دنیا میں ایسے واقعات کو ایکسپلائٹ کر کے ذاتی مفاد کا ذریعہ بنا لیتی تھیں پھر ایسی لڑکیاں جو ایک مرتبہ عزت گنوا لینے کے بعد ایسے لوگوں کے ہتھے چڑھ جاتی تھیں جو ان کی عزتوں کو مستقل سودا بنا کر بیچتے تھے۔ اسے وہ سارے بھیانک انجام یاد آنے لگے جن میں سے کوئی ایک اس کا مقدر بھی ہو سکتا تھا پھر اسے ایک ایک کر کے اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، عزیزوں، رشتہ داروں کے چہرے یاد آئے۔ جنہوں نے اسے دھتکار دیا تھا۔ اس کی سنے بغیر دھکے دے کر اسے گھر سے باہر نکال دیا تھا۔ وہ سب کے سب پڑھے لکھے اور مذہب کی باتیں کرنے والے لوگ تھے۔ یوں بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی بات دھیان سے سن لیتے، یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ اس پر اعتبار کر لیتے یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ اس کی عزت کو یوں سنبھال لیتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ مگر وہ سب کچھ جو ہو سکتا تھا نہیں ہوا اور وہ جس کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا وہ ہو گیا۔ پھر اسے عالیہ کا اپنا اور اس کے گھر والوں کا رویہ بھی یاد آیا۔ وہ وہی رویے تھے جن کی سختی اور شدت سے گھبرا کر اس نے اس سعد ابراہیم کی نکاح کی پیشکش کو قبول کر لیا تھا جو اس کے اپنے خیال کے مطابق سنگسار کیے جانے کے قابل تھا۔

''اس اسلامی جمہوریہ میں وہ کون سا اسلامی قانون نافذ ہے جس کی رو سے اس شخص کو سرعام کوڑے مارے جائیں اور سنگسار کیا جائے۔ وہ زانی ہے اور زنا کا اعتراف بھی کر چکا ہے۔'' اسے یاد آیا جس رات عالیہ اسے اپنے دلائل سے سعد ابراہیم سے نکاح کے لیے قائل کر رہی تھی، اس نے اس سے کہا تھا۔

''جو تمہارے ساتھ ہوا اس میں غلط فہمی کا دخل تھا۔ وہ وہاں تمہارے لیے نہیں ایک ایسی لڑکی کے لیے گیا تھا۔ جس کا پیشہ ہی جسم فروشی ہے۔ تم اس کے اس فعل کی طرف نظر کیوں نہیں کرتیں کہ اس نے تم سے شادی کر لی۔ اس نے اپنی غلطی کا اپنے گناہ کا اعتراف بھی کیا ہے، تمہاری زندگی کی بربادی کا سوچ کر اس کا کفارہ بھی ادا کر دیا۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے مذہبی صوم وصلوٰۃ کے پابند گھر والے اعلیٰ ظرف ہیں یا یہ زانی، شرابی،

سعد ابراہیم۔'' وہ دن پہلے ہسپتال کے اس پرائیویٹ روم میں اس کے سامنے بیٹھی عالیہ نے ایک مرتبہ پھر اسے سمجھایا تھا۔

''میں ایک مرتبہ نہیں دس مرتبہ تم سے کہوں گی افروز! کہ تم ناشکری کر رہی ہو۔ جو برا نہیں ہونا چاہیے تھا اس کے غم میں مبتلا رہنے کا ارادہ کیے بیٹھی ہو، جو بہتر ہوا اس کا شکر ادا کرنا بھول گئی ہو۔ اس معاشرے میں کوئی قانون نافذ نہیں ہے نہ اللہ کا نہ انسان کا، یہاں رفتہ رفتہ جنگل کے قوانین کا نفاذ ہوتا جا رہا ہے۔ جو طاقت ور ہے وہی بادشاہ ہے۔ تم شکر کرو کہ جو تمہارے ساتھ ہوا، اس کے بعد ان چاہی سہی عزت کی زندگی تمہیں میسر ہوئی۔'' عالیہ نے اس سے کہا تھا۔

''شاید وہ ٹھیک کہتی ہے، شاید جو ہوا یہ ہی ٹھیک ہے۔'' اس شام افروز نے سوچا اور اپنے آنسو پونچھ لیے اس نے نہ کڑھنے اور نہ رونے کا عہد کر لیا تھا۔ حالانکہ اس کے دل کے اندر کہیں بہت دور اب بھی کوئی بین کر رہا تھا ایک بدکردار، زانی اور شرابی شخص جو اس کا شوہر بن گیا تھا وہی اب اس بچے کا باپ بننے والا تھا جسے ابھی اس دنیا میں آنا تھا۔

☆

سعد ابراہیم نے محسوس کیا تھا کہ وہ اب پرسکون ہوتی جا رہی ہے۔ گو اب بھی وہ کبھی کبھار کچھ وقت کے لیے محض اسے دیکھنے کے لیے آتا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر نہ بے ہوش ہوتی تھی نہ واویلا مچاتی تھی۔ اس کے آنسو جو پہلے ہر دم اس کی آنکھوں سے بہتے رہتے تھے خشک ہو چکے تھے۔ اس نے اس اپارٹمنٹ کی قید تنہائی کو قبول کر لیا تھا اور عالیہ چغتائی سے اپنا تعلق بھی بھول گئی تھی۔ وہ چھوٹے چھوٹے کاموں میں مصروف نظر آتی تھی۔ صفائی کرتی ہوئی، کچن میں کام کرتی ہوئی، کوئی رسالہ اخبار جو وہ اسے پہنچاتا تھا پڑھتی ہوئی یا ٹی وی دیکھتی ہوئی۔ سعد کے دل کی خلش اور ضمیر کی چبھن کم ہونے لگی تھی۔ اس کو اب رات کو نیند بھی آنے لگی تھی۔

''یہ کتنی دیر چلے گا، یہ ایسے کتنی دیر رہ سکے گی۔'' اس نے کئی مرتبہ سوچا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے نکاح کر کے، بچے والے چکر سے اسے نجات دلوانے کے بعد وہ یہ گھر اور پیسہ اس کے نام کر کے اسے آزاد کر دے گا۔ یوں وہ اس خلش کے اثر سے نکل جائے گا جو اس کی غلطی کی وجہ سے اس کے دل میں پیدا ہو گئی تھی۔ مگر حالات اور واقعات اس کی توقع کے بالکل برعکس جا رہے تھے۔ بعض اوقات اسے اپنا یہ جذباتی فیصلہ انتہائی احمقانہ لگتا تھا۔ کئی مرتبہ اس نے سوچا تھا کہ انجان بنے رہنے میں اس کا کوئی نقصان نہیں تھا۔ وہ کسی طرح بھی اسے مجرم ثابت نہیں کر سکتی تھی۔ مگر وہ یہ بہت سوچنے کے باوجود یہ سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا تھا۔ وہ یقیناً عالیہ کی باتوں سے نہیں ڈرا تھا۔ وہ یقیناً یہ سوچ کر بھی مجبور نہیں تھا کہ اس کا نام کہیں آ گیا تو کیا ہو گا۔ اس نے یہ فیصلہ منٹوں میں کیا تھا، مگر اس فیصلہ کر لینے کی وجہ..... وہ کبھی سمجھ نہیں پایا۔

☆

اس روز جب وہ آیا تھا جہاں افروز نے اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمکتے دیکھے تھے، موسم بدل رہا تھا اور اب گرمی کی شدت کم ہو چکی تھی۔ اگر باہر کہیں تھوڑی بہت حدت تھی بھی تو یقیناً اس کی گاڑی ائیر کنڈیشنڈ تھی۔ پھر پارکنگ لاٹ سے لفٹ میں سوار ہو کر اوپر آتے آتے ہی وہ پسینے میں کیسے نہا گیا تھا۔

''شاید لفٹ خراب ہو یا شاید لائٹ نہیں ہے۔'' اس نے بے اختیار پنکھے کی طرف دیکھا جو اپنی آہستہ رفتار میں چل رہا تھا۔

''پانی کا گلاس ملے گا؟'' اس نے ہاتھ میں پکڑے شاپر ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا اور خود صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ اس کے لیے یخ پانی کا گلاس لے آئی۔ اس نے دو گلاس مزید پانی پیا۔ اسے پانی گلاس میں انڈیلتے دیکھ کر افروز کی آنکھوں کے سامنے اس بھیانک رات کا منظر آ گیا۔ پانی پی کر وہ دوبارہ صوفے پر نیم دراز ہو گیا۔ وہ ٹینس کورٹ سے شاید سیدھا ادھر آ گیا تھا افروز نے اب غور کیا اس نے شارٹس اور سپورٹس شرٹ پہن رکھی تھی اور سپورٹس شوز بھی۔ وہ نیشنل لیول کا اچھا پلیئر تھا یہ بات عالیہ نے اسے بتائی تھی۔ صوفے پر لیٹے لیٹے وہ کچھ دیر اپنے سامنے بیٹھی افروز کو دیکھتا رہا۔

''جہاں افروز آؤ، میرے پاس۔'' اس نے اس سارے عرصے میں پہلی مرتبہ اس کو یوں مخاطب کیا تھا۔ افروز اپنی جگہ بیٹھی رہی۔

''جہاں افروز، یہاں میرے پاس آؤ۔'' اس نے بھاری آواز میں دوبارہ کہا۔ افروز پر اس بات کا اثر نہیں ہوا۔

''تمہیں میرے شرابی اور زانی ہونے پر اعتراض ہے نا؟'' اس کے ردعمل پر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''ایک کاغذ کی رو سے میں تمہارا شوہر ہوں۔ کیا تم چاہو گی کہ تمہارا شوہر جو بھی وہ ہو، ان دونوں عوارض میں مبتلا رہے؟ افروز نے چونک کر اسے دیکھا ''نہیں نا؟'' اس نے یقین سے کہا۔ ''تو پھر یہاں میرے پاس آؤ، تم تو میری قانونی بیوی ہو نا۔'' افروز نے خود کو اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے قریب جاتے محسوس کیا تھا۔

☆

''تم نے نماز ختم کر لی۔'' اسے اپنی جانب دیکھتے پا کر سعد نے اس سے پوچھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''تم کتنے عرصے بعد روئی ہو، کچھ یاد ہے تمہیں؟'' اس نے دوسرا سوال کیا۔ افروز نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تم کیا دعا مانگ رہی تھیں؟'' اس نے تیسرا سوال کیا۔ وہ خاموش رہی اس مرتبہ اس کا سر نہ اثبات میں ہلا نہ نفی میں۔

''تم مجھے بددعائیں دے رہی تھیں۔ اپنے خدا سے میرے لیے برا مانگ رہی تھیں ہے نا؟'' اس نے چوتھا سوال کیا۔ افروز نے اب کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ انتہائی سنجیدگی سے یہ بات پوچھ رہا تھا۔ افروز کو لگا

وہ اس کے دل کا حال جان رہا تھا۔ اسے سعد کے قرب سے کتنی گھن آتی تھی۔ وہ سمجھ گیا تھا۔ وہ اس کے قریب آتا تھا تو اس کے اردگرد تعفن پھیل جاتا تھا۔ وہ خود کو بہت سمجھانے کے باوجود یہ نہیں سمجھا پائی تھی کہ اسے سعد کے انتہائی ذاتی کردار کو نظر انداز کر کے اس بارے میں سوچنا چاہیے کہ ایسے حالات میں اس نے اس کو قبول کر لیا۔ مگر وہ اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس کے لیے دعا کرتی تھی یا نہیں، اسے بددعا ہرگز نہیں دیتی تھی۔

''تمہارے نزدیک میں ایک برا شخص ہوں۔ ہے نا؟'' یہ پانچویں بات بھی سعد نے کی تھی۔

''مجھے پارسائی کا کوئی دعویٰ بھی نہیں کرنا۔ اس شہر میں بہت کچھ ہو رہا ہے۔ بار رومز کھلے ہیں، کیسینوز چل رہے ہیں، جسم فروشی عام ہے، برائی ہر رنگ میں اپنے عروج پر ہے کسی کو پکڑ کا کوئی خوف نہیں ہے۔ کیونکہ پکڑنے والے خود ہر برائی میں مشغول ہیں۔ میں بھی شاید بروں کے اسی گروہ کا ایک فرد تھا۔'' افروز نے لفظ تھا پر چونک کر اسے دیکھا۔

''ہاں میں تھا۔'' اس نے سر جھکا کر اعتراف کیا۔ ''مگر اب میں شعوری کوشش کر رہا ہوں کہ میں ان برائیوں سے کنارہ کر لوں، ویسے بھی میں برائی کی کیچڑ میں نیا نیا پھنسا تھا جب تمہارے والا واقعہ پیش آ گیا۔ میرا خیال ہے کہ خدا مجھے ان لعنتوں سے بچانا چاہتا تھا۔

میرے گھر کا ماحول مذہبی نہیں ہے۔ عید شب برات پر میرے والد مسجد میں نماز پڑھتے ہیں کیونکہ یہ ان کی نوکری کی مجبوری ہے۔ میری ممی گھر میں میلاد کرواتی ہیں مگر نماز پڑھتے میں نے شاید ہی کبھی ان کو دیکھا ہو۔ میری بہنیں اور میرا بھائی اور میں ہم سب ہی ایسے ہی ہیں۔ مگر گناہ کی پٹی کسی گھر میں بچوں کو بٹھا کر نہیں پڑھائی جاتی۔ میرے گھر میں بھی نہیں پڑھائی گئی۔ ہم سب بہن بھائیوں نے قاری صاحب سے قرآن پاک بھی پڑھا ہے۔ یہ معاشرتی تعلقات ہوتے ہیں جو کبھی تو انسان کو بچائے رکھتے ہیں اور کبھی یہ ہی گناہ کی طرف راغب کر دیتے ہیں۔ میں نے اپنے دوستوں سے گناہ کی لذت کے بارے میں اتنی مرتبہ سنا کہ میرا دل چاہنے لگا میں اس تجربے سے گزر کر دیکھوں۔ یہ مت سمجھنا کہ تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتی نے مجھے گناہ ترک کر دینے کا خیال دلایا ہے۔ کیونکہ میں بے حد پریکٹیکل انسان ہوں، میں نے اپنے تجربے کی رو سے سمجھا ہے کہ گناہ میں کیا برائی ہے کیا قباحت ہے کہ اسے گناہ کا نام دیا گیا۔ شراب سے کیوں منع کیا گیا، میں نے اپنے تجربے سے محسوس کیا کہ کیونکہ یہ ہوش و خرد سے بے گانہ کر کے انسان کو اچھے برے کی تمیز بھلا دیتی ہے اس لیے یہ حرام قرار دے دی گئی۔ زنا گناہ ہے کیوں یہ بھی میں نے اپنے تجربے سے محسوس کیا۔ تمہارے والے واقعے کے بعد میں نے دانستہ طور پر کئی لڑکیوں کے ساتھ راتیں گزاریں، اس لڑکی ٹینا شہزاد کے ساتھ بھی۔ پھر میں نے دوبارہ تمہاری قربت کو محسوس کیا۔ ہاں حلال حلال ہے اور حرام حرام۔ میں نے ان تجربوں سے گزرنے کے بعد خود فیصلہ کیا اور پھر میں نے یاد کیا کہ میرے ساتھ اوپر تلے ایسے واقعات کیوں ہوتے گئے کہ میں خود ان تجربوں

سے گزرنے کی خواہش کرنے لگا۔ تمہارے والے واقعے کے بعد مجھے مکافاتِ عمل کے تصور نے، نہیں بلکہ راتوں کو نیند میں بے چین ہو جانے والی کیفیت نے ڈرا دیا۔ تمہاری دوست نے مجھے دنیا اور آخرت کے سارے نفع و نقصان گنوا دیے مگر میرے کان پر جوں نہ رینگتی اگر میرے اندر سے یہ آواز نہ اٹھتی کہ تمہاری زندگی کی بربادی کچھ عرصے کے بعد میری اپنی زندگی کو بھی برباد کر کے رکھ دے گی۔ یقیناً اللہ نہیں چاہتا کہ میں کچھ غلط کروں، یقیناً وہ مجھے اس کیچڑ سے نکال لینا چاہتا تھا، جب ہی اس نے مجھے تجربات کی بھٹی میں ڈال دیا۔ میں اب بھی یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں پارسائی کی راہ پر چل نکلا ہوں۔ میرے اندر اب بھی کہیں کہیں شیطان اور شر سر اٹھاتے ہیں۔ میرا سوشل مرکل ہے ہی اسی طرح کا کہ میں فی الحال بہت سی باتوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر پا رہا۔ مگر میرے دل کی کیفیت مجھے اشارہ دے رہی ہے کہ میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہو جاؤں گا۔'' افروز گم صم بیٹھی اس شخص کے منہ سے یہ باتیں سن رہی تھی جو زمانے بھر کا مغرور، گھمنڈی اور بدمزاج مشہور تھا۔

''پیدائشی مسلمان ہونا کوئی بڑی بات نہیں ہوتی۔ البتہ اللہ کا احسان ضرور ہوتا ہے مگر انسان حقیقت میں مسلمان ہو جائے یہ کم کم نصیب میں ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ عمر بھر کے مسلمان رہ کر بے عملی میں گزار دیتے ہیں۔ میں اس تجزیے میں بھی مصروف ہوں کہ باعمل ہونے اور بے عمل رہنے میں کیا فرق ہے۔''

''اگر تم مجھے یونہی بددعائیں دیتی رہیں تو شاید میرے سارے تجربات اور تجزیے ناکام ہو جائیں۔'' آخری بات اس نے مسکرا کر کہی۔

''جن کو خدا نہ لگنا چاہے، انہیں لاکھ بددعائیں دی جائیں، نہیں لگتیں۔'' افروز نے بے اختیار کہا۔

''تم ذہن و دل کے اس سٹیج پر بہتر ہے کہ کسی سکالر سے رہنمائی حاصل کر لو۔''

''نہیں میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میری زندگی میں کوئی بڑا انقلاب نہیں آیا۔'' اس کا لہجہ ایک دم پہلے کی طرح درشت ہو گیا۔ میں اپنا رستہ خود دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ میں ایک اچھا انسان بنوں، تاکہ جب میری جان اپنے رب کے پاس پہنچے تو میں اپنے رب کے سامنے سرخرو ہو سکوں۔''

افروز کو محسوس ہوا سعد کی باتیں اس کے دل پر چھریاں چلا رہی تھیں۔ وہ کن خیالوں میں گم تھی اس کا دل کس چیز کا ماتم کرتا رہا تھا اور وہ شخص جس کے متعلق اس کا خیال تھا مرنے کے بعد سیدھا جہنم رسید ہو گا کون سی منزلوں کو پا رہا تھا۔

''کل مجھے ڈاکٹر عائشہ کے پاس جانا ہے چیک اپ کے لیے۔'' اس نے لاشعوری طور پر موضوع بدلنے کی کوشش کی۔

''نہیں۔'' وہ بھاری آواز میں بولا۔ ''تم ڈاکٹر عائشہ کے پاس نہیں جاؤ گی اور نہ یہاں کسی لوکل ڈاکٹر

کے پاس۔ جو میرا اور تمہارا معاملہ ہے، وہ اب تک میرے گھر والوں اور دوستوں سے چھپا ہوا ہے۔ میں اس کو ظاہر کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں، نہ ہی میں ایسا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں انگلینڈ لے جانے کا انتظام کر رہا ہوں۔ یہ ڈیلوری وہیں ہوگی اور اُس وقت تک تم وہیں رہو گی۔''

''کیوں؟'' ایک گھٹی ہوئی آواز افروز کے حلق سے نکلی۔ وہ اس کو یوں چھپا کر رکھے ہوئے تھا، پھر اس نکاح والے احسان کا کیا فائدہ تھا۔

''اس کیوں کا جواب تو میں نے دے دیا ہے۔ شاید اگلے ہفتے تم کو جانا ہوگا۔ یہ گھر اور میری یہاں آمد و رفت کسی بھی وقت کسی کی نظر میں آسکتی ہے۔ میں اپنے امتحان کی تیاری سکون سے کرنا چاہتا ہوں کسی شور شرابے کا متحمل نہیں ہو سکتا اس لیے بہتر یہ ہی ہے کہ تم یہاں سے شفٹ ہو جاؤ۔''

افروز کی زندگی کے سارے فیصلے یونہی اچانک ہوتے چلے جا رہے تھے اور کر بھی کوئی اور رہا تھا۔ وہ اپنے اللہ سے اپنی بہتری کے لیے دعا کرتی تھی اور اسے لگتا تھا کہ اسے عمر بھر یونہی چوروں کی طرح منہ چھپا کر زندگی گزارنا ہے۔

☆

اسے محسوس ہوا تھا کہ بیرونی دروازے پر کسی نے ہاتھ مارا ہے۔ دو مرتبہ اس کا ہینڈل بھی دبایا گیا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ اس اپارٹمنٹ سے کبھی باہر نہیں نکلی تھی اسے معلوم نہیں تھا کہ سامنے والے فلیٹ میں کون رہتا تھا۔ مگر جب سے وہ یہاں رہ رہی تھی اسے سکیورٹی کا یا دوسرا کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ باہر کی دنیا دیکھنے کا شوق وہ بیڈ روم کی کھڑکی سے سامنے سڑک پر رواں دواں ٹریفک کا نظارہ کر کے پورا کر لیتی تھی۔ مگر وہ دن مختلف تھا۔ اب دستک اور دروازہ کھولنے کی کوشش تیز ہو رہی تھی۔ اس نے اپنی تمام ہمت مجتمع کر کے میجک آئی سے باہر جھانکا، ایک مرد اور ایک عورت دروازے کے بالکل قریب کھڑے تھے اور ان کے چہروں پر رومال بندھے تھے۔ اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر خود کو بیڈ روم میں منتقل کر لیا۔ بلند آواز میں آیت الکرسی پڑھتے ہوئے اس نے موبائل پر سعد کا انتہائی پرسنل نمبر ملایا۔ ایک سیکنڈ کے اندر وہ لائن پر تھا۔ اس نے کانپتی آواز میں اسے صورتحال سے آگاہ کیا۔

''تم بیڈ روم ہی میں رہو۔ میں پہنچ رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔ پھر اسے محسوس ہوا کہ آنے والوں نے کسی طرح بیرونی دروازہ کھول لیا۔ وہ یقیناً کوئی بڑے ایکسپرٹ لوگ تھے جب ہی ڈبل لاک سسٹم کا دروازہ کھل گیا تھا۔ اب باہر لاؤنج میں کھڑپڑ اور سرگوشیوں کی آوازیں آنے لگی تھیں۔ پھر بیڈ روم کے دروازے کا ہینڈل دبا۔ افروز کو اپنی موت سامنے نظر آنے لگی۔ کوئی دروازے کو ٹکر مار رہا تھا۔ دروازہ اب اپنی جگہ سے ہل رہا تھا اور آدھا کھل کر بند ہو جاتا تھا۔ افروز بیڈ کے پیچھے چھپ گئی۔ اس کا ہاتھ ایک مرتبہ پھر سعد کا نمبر ملانے

لگا، مگر نیٹ ورک مصروف مل رہا تھا۔

''تم خدا سے ہر وقت شکوہ کرتی رہتی تھیں، جب ہی یہ وقت تم پر آیا۔'' اس کے دل نے اسے یاد دلایا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جب ہی اسے باہر دھینگا مشتی کی آوازیں آنے لگیں۔ اور اچھا خاصا شور سا مچ گیا۔ وہ ڈھے سی گئی۔ تقریباً بیس منٹ بعد کمرے کا دروازہ کھل گیا۔

''افروز۔'' اسے سعد کی آواز آئی ''افروز! تم کہاں ہو؟'' وہ باتھ روم کا دروازہ کھول کر اندر جھانک لینے کے بعد ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ وہ اسے جواب دینا چاہتی تھی مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔'' وہ پیچھے مڑ کر کسی اور سے مخاطب ہوا تھا۔ پھر اسے وہ بیڈ کے پیچھے نڈھال پڑی نظر آ گئی تھی۔ اس نے اس کا بازو پکڑ کر اسے اٹھایا اور اپنے ساتھ لگائے لگائے باہر لے آیا۔ اس کمرے میں ایک عورت اور مرد کے علاوہ دو اور مرد بھی موجود تھے۔

''سمیع، نیاز، تم لوگ باہر چلو۔'' اس نے ان دو مردوں سے کہا جو ایک طرف کھڑے تھے۔ وہ دونوں باہر نکل گئے۔ افروز نے آنکھیں پوری طرح کھول کر دیکھا۔ اس کے سامنے دو مانوس چہرے تھے۔ اس کے بڑے بھائی اور بہن کے چہرے۔

''انہیں پہچانتی ہو۔'' سعد نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ افروز نے سہمی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا، اس نے اور بھی مضبوطی سے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

''یہ تمہارا بھائی اور یہ تمہاری بہن تمہیں قتل کرنے آئے تھے۔ غیرت کے نام پر، ہاہا۔'' اس نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

''تم کمینے، ذلیل انسان۔'' اس کا بھائی یکدم سعد کی طرف بڑھا۔ وہ سخت طیش میں تھا۔ ''ہماری عزتوں کے جنازے نکالنے والے کتے، میں صرف اس کو نہیں، تمہیں بھی مارنے آیا تھا۔''

''مارو۔'' سعد نے سیدھے ہوتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں تمہارے سامنے کھڑے ہیں مار دو۔'' افروز کا بھائی ایک مرتبہ پھر آگے بڑھا۔ اس کی بہن نے آگے آ کر اسے روک لیا۔

''غیرت تمہاری طرح بہن کو گھر سے نکال کر ذلیل و خوار ہونے کے لیے چھوڑ دینے کا نام ہے تو پھر تو تم بہت غیرت مند ہو، تمہیں ایوارڈ ملنا چاہیے غیرت مندی کا۔'' سعد نے استہزائیہ انداز میں کہا۔

''یہ تو تمہارے لیے اور تم اس کے لیے اسی روز مر گئے تھے۔ پھر مری ہوئی کو دوبارہ مارنے کے لیے کیوں آئے ہو؟''

''یہ تمہاری داشتہ بن کر رہ رہی ہے میں اس کو۔'' سعد کے زوردار تھپڑ نے افروز کے بھائی کی ناک سے خون چھلکا دیا تھا۔

''میں تمہاری جان لے لوں گا اگر تم نے ایسی بکواس دوبارہ کبھی کرنے کا سوچا بھی تو، یہ میری قانونی اور جائز بیوی ہے۔ تمہاری غیرت والا فارمولا میں نہیں مانتا۔ لیکن اگر کسی کو مار دینے کا کہتا ہوں تو اپنے کہے پر عمل کرنا اچھی طرح جانتا ہوں۔''

''تم اتنی گھٹیا اور ذلیل نکلو گی افروز! ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ غیرت لٹانے کا ناٹک کرنے کی کیا ضرورت تھی، ہمیں کہتیں اس رئیس زادے کے ساتھ رہنا تھا ہم تمہیں اپنے ہاتھوں سے رخصت کر دیتے۔'' افروز کی بہن نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

''گھٹیا اور ذلیل تم لوگ ہو۔ تم سب۔'' افروز نے سعد کے بازو کا سہارا لے کر تن کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ پتھر دل اور ظالم، خدا نے میری عزت لوٹنے والے کے دل میں میری عزت، مجھے لوٹانے کا خیال اگر ڈال دیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تم لوگوں کی نسبت میرے لیے زیادہ بہتر ہے۔ مجھے سعد ابراہیم کی رفاقت پر فخر اور تم لوگوں سے اپنے تعلق کا سوچ کر سخت شرمندگی ہوتی ہے۔''

''کمینی اور گھٹیا ہو۔'' اس کی بہن پھنکاری ''شاید ہمیشہ سے ہی جب ہی ایسی گندی زندگی تمہارا مقدر بنی۔''

''افروز! میں تمہاری وجہ سے ان کا لحاظ کر رہا ہوں۔'' سعد نے اسے یاد دلایا۔

''یہ میرے کوئی نہیں ہیں۔ میں ان کے متعلق سوچنا بھی نہیں چاہتی۔'' افروز نے شدت کرب سے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

''سمیع، نیاز۔'' سعد نے بلند آواز میں کہا۔ وہ دونوں آدمی واپس کمرے میں آ گئے۔ ''ان دونوں خاتون و حضرات کو لے جاؤ یہاں سے اور ان کا یہ کھلونا بھی دے دینا ان کو۔'' اس نے ایک ریوالور ان میں سے ایک کی طرف اچھالا۔ ''انہیں اچھی طرح سمجھا دینا، تم دونوں کون ہو اور افروز کس کی پناہ میں ہے۔''

''چلو، آگے لگو۔'' ان میں سے ایک نے افروز کی بہن اور بھائی کو ریوالور کے اشارے سے کہا۔ وہ دونوں مرے مرے قدموں سے چلتے ان کے پیچھے چل پڑے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ سعد نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔

''کم ان ناؤ۔'' اس نے واپس آ کر افروز کو صوفے پر بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اچھا ہوا ان لوگوں کو علم ہو گیا کہ وہ کتنے پانی میں ہیں'' مگر افروز کا ذہن اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔ کیا اس کے گھر والے اس حد تک آگے جا سکتے تھے۔ اس کی جان لے کر ان کو کیا ملتا۔ اس کے بھائی جیل کی سلاخوں کے پیچھے چلے جاتے اور باقی کا خاندان فخر سے سر اٹھائے پھرتا۔

''اسی لیے میں تمہیں یہاں نہیں رکھنا چاہتا، مجھے علم ہے یہاں رہنے سے مزید فتنے سر اٹھائیں

گے۔'' اس رات وہ پہلی بار ادھر ہی ٹھہرا تھا اور پہلی مرتبہ اس نے افروز کا پکایا ہوا کھانا کھایا تھا، ساتھ ساتھ وہ اسے اپنے فیصلے کے درست ہونے کی کہانی بھی سنا رہا تھا۔

''مگر یہ ہے کیا؟'' افروز نے نیپکن ہاٹ پاٹ میں پٹخ کر کہا۔ ''چوروں کی سی زندگی، چھپ چھپا کر گزرتی زندگی۔ جو بھی سنے گا اسے داشتاؤں کی سی زندگی ہی کہے گا نا۔ تم نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا۔ اتنا بڑا احسان کر دیا اب کیوں نہیں اس کو ڈکلیئر کر دیتے۔ کیوں نہیں بتاتے لوگوں کو کہ تم نے۔''

بات کرتے کرتے اس کی نظر سعد کے چہرے پر پڑی اس پر نجانے کیا لکھا تھا کہ وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

''تم اپنے سامان کی پیکنگ شروع کرو۔ میں ایک دو دن کے اندر جانے کا انتظام کرتا ہوں۔'' وہ یقیناً کچھ اور کہنے والا تھا مگر اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے کچھ اور کہا تھا۔

''اور اگر میں نہ جاؤں تو؟''

''بلیک میل کرنا چاہتی ہو؟'' وہ دانت کچکچا کر بولا۔ ''میں نے بہت پہلے یہ بات کہی تھی کہ تم مجھے بلیک میل نہیں کر سکتی ہو، نہ ہی میں بلیک میل ہونے والوں میں سے ہوں۔ رہی بات تمہارے نہ جانے کی تو مت جاؤ۔'' اس نے شانے اچکا کر کہا۔ ''یہ گھر اور اپنا اکاؤنٹ سنبھالو، مگر بھول جاؤ کہ سعد ابراہیم نام کا کوئی شخص تمہاری زندگی میں آیا تھا۔''

''تم اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتے۔'' اب دانت پیسنے کی باری افروز کی تھی۔

''تم اس حقیقت کو منوا نہیں سکو گی۔''

''میرے پاس نکاح نامہ ہے۔ اس اپارٹمنٹ کے پیپرز اور کریڈٹ کارڈز۔''

''اوہو۔'' اس نے نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا، ذرا لاؤ تو یہ تینوں ڈاکومینٹس۔'' پھر وہ خود ہی اٹھ کر بیڈ روم کی وارڈ روب کے دراز سے وہ سب اٹھا لیا۔

''یہ دیکھو یہ نکاح نامہ، یہ شناختی کارڈ، یہ پیپرز، یہ کریڈٹ کارڈ۔'' اصلی نقلی کا فرق معلوم ہے نہیں۔ یہ کاغذات یہ کارڈز جینوئن ہیں، تمہیں یقین ہے۔ کریڈٹ کارڈ وہ ہے جو تم نے ابھی استعمال ہی نہیں کیا۔ کر کے دیکھنا چاہتی ہو؟'' افروز کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ اس دنیا کے لوگوں سے جو بھی توقع کرتی کم تھا۔

''اور وہ جو تم کہہ رہے تھے تم اپنا راستہ دریافت کر رہے تھے۔ پیدائشی نام کے مسلمان سے حقیقی مسلمان بننے کا راستہ؟'' اس نے اسے ایک اور پہلو سے ایکسپلائٹ کرنے کی کوشش کی۔

''وہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ اس بات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔'' وہ متاثر ہوئے بغیر بولا۔

''تم دال اچھی پکاتی ہو۔ پہلے کبھی میں نے دال اتنی رغبت سے نہیں کھائی۔'' اسے پیچ و تاب کھاتے

دیکھ کر وہ محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ افروز نے اپنے سامنے سے برتن ہٹائے اور پاؤں پٹختی صوفے پر جا بیٹھی۔ وہ اطمینان سے بیٹھا کھانا کھاتا رہا۔ کھانا ختم کرنے کے بعد اس نے برتن اٹھا کر کچن میں رکھے۔ اب وہ کچن میں کسی کام میں مصروف تھا۔ کچھ دیر بعد وہ کافی کا وہ مگ اٹھائے ادھر ہی آ گیا۔

''غصہ تھوک دو افروز!'' اس نے ایک مگ اس کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں۔ لیکن دیکھو تم غیر متوقع طور پر میری زندگی میں آئی ہو۔ زندگی کے اس اتفاق کو میں نباہ تو سکتا ہوں مگر اپنی زندگی کے متعلق میرے اپنے کچھ خواب ہیں میرے والدین کی خواہشات ہیں۔ جن کا تعلق تم سے ہرگز نہیں ہے۔ میری اپنی زندگی تقسیم ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں جو غلطی مجھ سے ہوئی اس کا خمیازہ مجھے اسی ڈھنگ سے ادا کرنا ہے۔ تمہارے حقوق، تمہاری ذمہ داری میں عمر بھر نبھانے کے لیے تیار ہوں۔ مگر اپنی زندگی میں اپنی مرضی سے گزاروں گا اپنی پسند سے۔''

جذبات اور سوچوں کی یلغار نے افروز کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری کر دیا تھا۔ اسے زندگی میں اپنی کوئی حیثیت نظر نہیں آ رہی تھی۔

''نماز نہیں پڑھو گی تم ٹائم ہو رہا ہے۔'' وہ اسے دانستہ تنگ کر رہا تھا کم از کم اسے تو یوں ہی محسوس ہو رہا تھا۔

''میں سونے جا رہا ہوں، تم جب جلنے بھننے اور نماز سے فارغ ہو جاؤ تو آ جانا۔'' وہ بیڈ روم میں جاتے ہوئے بولا۔

☆

''یہ لنکاسٹر کا علاقہ ہے۔ گراس میر اس کے قریبی قصبوں میں سے ایک ہے۔ تم وہاں رہو گی۔ میں نے ایک گھر وہاں تمہارے لیے خرید لیا ہے۔ مسز جوزف ایک اولڈ لیڈی ہیں۔ پہلے یہ پاکستان میں رہتی تھیں ہماری ایک شناسا فیملی کے بچوں کی گورنس تھیں، اب واپس آ چکی ہیں اور تمہارے ساتھ وہی رہیں گی۔'' ہیتھرو ائیر پورٹ سے نکل کر نجانے کونسی سمت کی طرف جاتے ہوئے سعد نے اسے بتایا تھا۔ افروز کو اب اس بات سے کوئی سروکار نہیں رہا تھا کہ وہ اسے کہاں کیسے اور کون سے علاقے میں چھوڑنے جا رہا تھا۔ اس کا ہر بات سے یقین اٹھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طویل سفر کے بعد وہ وہاں پہنچے تھے جس کے متعلق وہ راستہ بھر اسے بتاتا رہا تھا اور وہ ایک کاٹیج نما گھر تھا جس کے بارے میں وہ اسے بتا رہا تھا۔ جو چیز اسے سب سے زیادہ شدت سے محسوس ہوئی تھی، وہ موسم کا فرق تھا۔ اسے یہاں آتے ہی شدید سردی محسوس ہوئی تھی۔

مسز جوزف اس گھر میں پہلے سے موجود تھیں۔ کافی بہتر اردو بول لیتی تھیں اور سعد سے خاصی بے تکلف نظر آتی تھیں۔

''مسز جوزف بہت اچھی دوست ہیں، بہت مددگار اور ہمدرد میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ ہی سہی گاڑی مسز جوزف کے کہنے پر خریدی ہے۔ انہیں یہاں کے ہر راستے کا علم ہے اور یہ ڈرائیو کرنا بھی جانتی ہیں۔ تمہاری کنڈیشن اگر سفر کرنے کی ہو تو تم ان کے ساتھ گھومنے پھرنے باہر نکل سکتی ہو۔ لنکا سسٹر کے ایک نرسنگ ہوم میں تمہارا نام کل رجسٹر ہو جائے گا۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔'' وہ موسم کا حال سنانے والے نیوز کاسٹر کی طرح رٹی رٹائی باتیں کر رہا تھا۔ افروز نے درد سے ٹوٹتی کمر کو صوفے کی پشت کا سہارا دے کر اس شخص کو دیکھا جو اب تک اسے نباہ رہا تھا، جس کی وہ اپنی چوائس ہرگز نہیں تھی اور جو اس کے اپنے بقول نام کے مسلمان سے حقیقی مسلمان بننے کا سفر طے کر رہا تھا۔ یقیناً اس سے یہ نباہ بھی اسی سفر کے سلسلے میں ایک کڑی تھی۔

''اور تم؟'' اس نے اپنے درد کو بھلانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''میں کل شام واپس فلائی کر جاؤں گا، دو دن کی یہ غیر حاضری بھی مجھے کافی مہنگی پڑے گی مگر یہ انتظام تو مجھے کرنا ہی تھا۔ یہ سب کام اتنے آسان نہیں تھے مگر میرے والد کے سورسز میرے بہت کام آئے۔''

''کیا اس طرح بہت سے لوگوں پر اس بات کا انکشاف نہیں ہو جائے گا جسے تم چھپانا چاہتے ہو؟''

''جو چھپا رہنا چاہیے وہ چھپا ہی رہے گا۔ مجھے خوب معلوم ہے کہ اسے کیسے چھپانا ہے۔'' وہ مسکرایا۔ ''تم اب ریسٹ کرو، یقیناً تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' وہ اسے سہارا دے کر لکڑی سے بنے ایک چھوٹے سے زینے سے اوپر لے آیا۔ یہ لکڑی کے فرش اور اونچی چھت والا ایک ایسا بیڈ روم تھا، جس کا فرنیچر بھی قدیم وقتوں کی یاد دلاتا تھا۔'' اس نے اسے نرم گرم بیڈ پر لٹا دیا اور خود واش روم میں چلا گیا۔

جہاں افروز کو بچپن میں پڑھی پریوں کی کہانیاں یاد آنے لگیں۔ جن میں زندگی کے سارے روپ محض ایک ونڈر لینڈ میں داخل ہو جانے پر نظر آجاتے تھے۔ ایسے محسوس ہوا جیسے وہ بھی کسی ونڈر لینڈ میں داخل ہو گئی تھی، جہاں کبھی خوفناک چڑیل اس پر اپنے سیاہ وار کر کے اسے مصیبتوں میں پھنسا دیتی تھی اور کبھی مہربان پری اپنی جادوئی چھڑی کے ذریعے اسے اچھی پرسکون زندگی کی طرف لے آتی تھی۔''

زندگی ایک کوہ گراں
اور میں ایک کوہ کن
میرے تیشے کی دھار کند
اور زندگی ایک کوہ گراں

اسے بہت پہلے پڑھی ایک نظم یاد آنے لگی اور وہ اس کے الفاظ یاد کرتے کرتے نیند کی وادیوں میں اتر گئی۔ وہ نجانے کتنی دیر سوتی رہی۔ جب اس کی آنکھ کھلی اس نے کمرے میں نیم تاریکی محسوس کی۔ کتنی

دیر تو اس کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر اس کا بازو کسی انسان سے ٹکرایا۔ اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔

''کیا بات ہے؟'' اسے سعد کی نیند سے بھاری آواز سنائی دی وہ اس کے پہلو میں لیٹا تھا۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے؟'' اس نے بدقت کہا۔ سعد نے ٹیبل لیمپ آن کیا اور سائیڈ ٹیبل پر دھرے فلاسک سے پانی گلاس میں انڈیل کر اسے پکڑایا۔ وہ پانی نیم گرم تھا جب کہ اسے ٹھنڈے پانی کی خواہش محسوس ہو رہی تھی۔

''ٹمپریچر لو ہے یہاں، ٹھنڈا پانی تمہیں تکلیف دے گا'' سعد نے بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ افروز نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں نیند سے سرخ تھیں۔ اس کی شیو بھی بڑھی ہوئی تھی۔ اس نے شرٹ اتار کر سامنے کرسی پر ڈالی ہوئی تھی۔

''یہ شخص خود بھی تو خوار ہو رہا ہے اور کتنے سکون سے یہ ساری مصیبت سہہ رہا ہے۔'' ساری بات ٹھیک ہے یاد آنے پر اس نے سوچا۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' وہ مسکرایا۔ ''اب تو میں ایک اجنبی لٹیرا نہیں ہوں۔'' اس کی اس مسکراہٹ سے اب افروز کو خوف سا آنے لگا تھا وہ اتنا پرسکون کیوں رہتا تھا۔ وہ جھنجھلاتا کیوں نہیں تھا۔ اسے اس کی بدمزاجی اور غرور یاد آتا تھا جس کا اب کہیں نام ونشان بھی نظر نہیں آتا تھا۔ نجانے کس جذبے کے تحت اس نے اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ اسے سعد کے ہاتھ اپنے بالوں کو سہلاتے محسوس ہوئے۔

''بے کار کے وہم دل میں مت ڈالو، تم تو مجھ سے کہیں زیادہ باعمل مسلمان ہو، تمہیں تو قسمت پر اچھی بری تقدیر پر زیادہ یقین ہونا چاہیے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''یہ شخص جو شیطان تھا پھر فرشتہ بن گیا، یہ شخص جس نے اچھائی کو پانے کے لیے برائی کی بھٹی سے گزرنے کا سوچا اور برائی کی ہر سطح کو تجربہ کر کے جانچا۔ اس کے بارے میں افروز کی سوچ بھٹکتے بھٹکتے شہباز دتک پہنچی تو اس کا جی متلا گیا۔ اسے لگا اس کے اردگرد ہر طرف تعفن پھیل گیا ہو۔ اس نے ایک جھٹکے سے خود کو سعد سے الگ کیا اور بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ سعد اس کے اس عمل پر ششدر رہ گیا تھا۔ پھر جیسے فوراً ہی وہ کچھ سمجھ گیا۔

''تمہیں اگر فریش ہونا ہے تو وہ واش روم ہے، گرم پانی موجود ہے تم نہا لو، تمہاری تھکن کچھ اور اتر جائے گی۔'' اس نے پرسکون لہجے میں کہا اور خود بھی اٹھ کر اپنی شرٹ پہننے لگا۔

وہ جب واش روم سے واپس آئی وہ کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر دیکھا۔ نیچے سے اس کی آواز آ رہی تھی وہ مسز جوزف سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑی سوچتی رہی اور پھر وہ چند سیڑھیاں اتر کر نیچے چلی آئی۔

''ڈنر از ریڈی سویٹ ہارٹ۔'' مسز جوزف نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔'' افروز نے سعد کو دیکھا وہ اس چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر سکون سے بیٹھا چمچہ سے میز بجا رہا تھا۔

''یہ لو سعد! تمہارا فیورٹ فرائیڈ فش اور پران کری، مجھے اچھی طرح یاد ہے تمہیں سی فوڈ بہت پسند تھا۔'' مسز جوزف کہہ رہی تھیں۔ افروز اتنے مہینوں سے اس کی بیوی کی حیثیت سے زندگی گزار رہی تھی اور اسے بالکل پتہ نہیں تھا کہ اسے کیا پسند تھا۔

''اگر تمہاری تھکن دور ہو گئی ہو تو ڈنر کے بعد ذرا باہر چلتے ہیں، یہ جگہ قدرتی مناظر میں گھری ہوئی ہے۔ ادھر ہی کہیں لیک ڈسٹرکٹ بھی ہے ورڈز ورتھ کا لیک ڈسٹرکٹ، میرا خیال ہے کہ تمہیں لٹریچر میں ضرور دلچسپی ہو گی۔'' افروز کو اس کے اس قدر نارمل رویے پر حیرت بھی ہو رہی تھی اور طیش بھی آ رہا تھا۔

''مجھے پولاؤ بنانا بھی آتا ہے، افروج! تم یہ پلاؤ کھا کر بتاؤ کیسا ہے؟'' مسز جوزف نے اس کی پلیٹ خالی دیکھ کر میز بانی جتلائی۔

''مسز جوزف! آپ نے گرم لانگ کوٹ منگوا لیے تھے نا؟'' سعد نے ان سے پوچھا۔ ان کے اثبات میں سر ہلانے پر اس نے کھانا ختم کر کے نیپکن سے ہاتھ پونچھے۔

اور افروز کی پلیٹ کی طرف دیکھا۔ ''ناراضی تو مجھ سے ہے کھانے سے تو نہیں نا۔'' اس نے یہ بات پنجابی میں کہی تھی۔ افروز نے اس کے منہ سے پہلی مرتبہ یہ زبان سنی تھی اور جو اسے اچھی لگی۔ اس نے آہستہ آہستہ چاول ختم کیے اور سعد کی طرف دیکھنے لگی۔

''مسز جوزف وہ کوٹ!'' اس نے دوبارہ کہا۔ مسز جوزف چند سیکنڈ میں ایک مردانہ اور ایک زنانہ لانگ کوٹ لے آئیں۔ سعد نے لیڈیز کوٹ اس کی طرف بڑھایا۔ پھر اس نے اسے مفلر اور گرم اونی ٹوپی پکڑائی۔ یہ ''دستانے'' پھر اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے دستانے نکالے۔ ''چلو باہر نکل کر پہنتے ہیں۔'' پھر اس کی نظر افروز کے پاؤں پر پڑی۔ ''نو سوکس نو شوز۔'' اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ افروز کے سامان میں یہ چیزیں موجود تھیں۔ یہ وہ خریداری تھی جو لاہور سے روانہ ہونے سے پہلے وہ خود کر کے آیا تھا۔ افروز اٹھنے لگی ''رکو میں لے آتا ہوں۔'' اس نے چھلانگوں میں سیڑھیاں چڑھیں اور اس کے سامان سے دونوں چیزیں نکال لایا۔

''او کے مسز جوزف، وش می گڈ لک،'' وہ ہاتھ ہلا کر مسز جوزف سے مخاطب ہوا اور ہنستے ہوئے برتن سمیٹنے لگیں۔

باہر خنکی تھی بلکہ اچھی خاصی سردی تھی افروز کو جھرجھری آ گئی۔ سعد نے شیڈ کے نیچے کھڑی گاڑی نکالی

اور اس کے قریب لا کر کھڑی کر دی۔ وہ اس قصبے کی سڑکوں پر رواں تھا۔

''یہ یہاں کے روایتی گھر ہیں، یہ چرچ ہے، یہ یہاں کے بسس ہیں۔'' اس نے جلتی بجھتی روشنیوں والی عمارتوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ بازار یہ دکانیں۔'' وہ کمنٹری کئے جا رہا تھا مگر افروز چاہنے کے باوجود اس کی کسی بات کی طرف توجہ نہ دے پا رہی تھی۔ ایک جگہ نیم تاریکی میں آگ کا الاؤ نظر آیا۔

''اوہ یہ بوڑھے دیوانے۔'' سعد نے گاڑی کو ایک سائیڈ پر کر کے کھڑا کرتے ہوئے کہا۔

''آؤ دیکھیں یہ کیا کر رہے ہیں۔'' اس نے نیچے اترتے ہوئے کہا۔ اور اس کی سائیڈ پر آ کر اسے سہارا دے کر نیچے اتارا۔ وہ درختوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا درختوں کے درمیان پتھر کے بنچ بھی رکھے تھے اور ان ہی بنچوں پر چند بوڑھے انگریز درمیان میں خشک لکڑیوں کی آگ روشن کئے بلند آواز میں گانے گا رہے تھے۔ سعد نے آگے بڑھ کر ان میں سے ایک سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے قہقہے لگاتے ہوئے ان دونوں کو اپنے ساتھ شامل ہو جانے کی دعوت دی۔ سعد افروز کو سہارا دیئے ادھر لے آیا۔ ایک بوڑھے کے پاس چھوٹا کیتل ڈرم بھی تھا اور دوسرے کے پاس سمبلز تھے۔ وہ ان دونوں کی مشترکہ آواز پر گا رہے تھے۔ پھر ان میں دو تین اٹھ کر اس الاؤ کے گرد الٹے سیدھے قدم اٹھاتے ناچنے لگے۔

''تم بھی آؤ نوجوان!'' ایک نے سعد کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔

'ہولا لا لالا ہو ہو' وہ اسی قسم کی آوازیں نکالتے ناچ رہے تھے اور ان کے ساتھ وہ بھی متحرک تھا۔ پھر ان میں سے ایک نے کوٹ کی جیب سے بیئر کا ٹن نکال کر سعد کی طرف بڑھایا۔ سعد نے ردھم کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے افروز کی طرف دیکھا جو اس کا ردعمل دیکھنے کو بے چین تھی۔ اس نے یونہی قدم اٹھاتے اٹھاتے وہ ٹن پکڑ لیا اور اس کا اوپنر اٹھا کر اسے منہ سے لگا لیا۔ افروز کا دل ایک مرتبہ پھر متلا گیا۔

''ایک اور تجربہ۔'' اس نے سوچا اور پھر اس کی طرف دیکھا اس نے دو سانسوں میں ٹن ختم کر کے اسے ایک طرف اچھال دیا تھا۔ اب اس کے قدموں میں غیر معمولی تیزی آ گئی تھی۔

''یور پارٹنر۔'' ایک بوڑھے نے اشارہ کیا شاید وہ افروز کو بھی اپنی اسی مستی میں شامل کرنا چاہتے تھے۔

''نی ٹوٹلر۔'' اس نے ہانپتے ہوئے انگلی کے اشارے سے منع کیا۔ ''اینڈ شی از ایکسپیکٹنگ، کانٹ موو۔'' اس کا سانس اب پھولنے لگا تھا اور چہرے پر پسینے کے قطرے ابھرنے لگے تھے۔ پھر وہ رک گیا اور ہانپتا ہوا افروز کی طرف آیا۔ وہ اس کے ساتھ بینچ پر بیٹھا افروز سمٹ کر کنارے پر ہو گئی۔ اس نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور سر بنچ کی پشت سے لگا کر اپنا سانس بحال کرنے لگا۔ بوڑھے انگریزوں کا دوسرا گروپ اٹھ کر وہی خرمستیاں کرنے لگا تھا۔ سعد نے اٹھ کر ان سب سے ہاتھ ملایا۔ وہ اسے رکنے کو کہہ رہے تھے۔ مگر وہ معذرت کرتا گاڑی کی طرف چل دیا۔ افروز اس کے پیچھے چل آئی۔

واپسی کے راستے میں وہ خاموش رہا۔ افروز اسے اس کی شرمندگی خیال کرتی رہی۔ وہ اپنے دعوؤں کے برعکس اپنی عادات پر قابو نہ پا سکتا تھا۔

''بیئر، شراب کی کس فارم میں آتی ہے اس کا تعین ابھی مجھے کرنا ہے۔'' وہ خود ہی بولا'' مجھے یہ البتہ معلوم ہے کہ یہ خمار چڑھانے سے زیادہ سردی کی شدت کو کم کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔''

افروز نے سر جھٹک کر منہ پھیر لیا۔''ارے بابا میں نے یہ کب دعویٰ کیا ہے کہ بڑا پارسا ہوں۔'' وہ اس کی اس حرکت کو دیکھ کر ہنس کر بولا۔''میں جو بھی ہوں تمہارا معیار تو ہرگز نہیں ہو سکتا۔ تم بھی تو تباہ ہی رہی ہو نا۔ باقی ہم دونوں کی زندگیوں کی جہتیں الگ الگ ہیں۔''

افروز کے دل پر چھریاں چل گئیں۔ اس کا دل اسی وقت اس چلتی گاڑی سے کود جانے کو چاہنے لگا۔

''غصے میں تم پر جنون سوار ہو جاتا ہے، یہ اچھی عادت نہیں ہے۔'' اس نے بغیر اس کی طرف دیکھے کہا۔''ایسے لوگ صرف اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ادھر چلیں۔'' اس نے ایک قہوہ خانے کی طرف اشارہ کیا۔

''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے۔'' افروز نے جلے بھنے انداز میں کہا۔

''او کے۔'' اس نے گاڑی روکنے کا ارادہ ملتوی کیا۔ دس منٹ میں وہ واپس پہنچ چکے تھے۔

☆

ایک قریبی نرسنگ ہوم میں اس کو رجسٹر کروا کے، چند ضروری چیزیں دلوانے اور مسز جوزف کو اس کے بارے میں ضروری ہدایات دینے کے بعد اگلی شام وہ واپس چلا گیا۔

''یہاں سے اگر تم چاہو تو اپنی دوست عالیہ چغتائی سے رابطہ کر سکتی ہو۔'' جانے سے پہلے اس نے اپنے تئیں فراخ دلی سے کہا افروز کو اس وقت اس کے ہر عمل، اس کی ہر بات سے شدید چڑ ہو رہی تھی۔ وہ بے زاری سے اس کی ہر بات سن رہی تھی۔

لاہور میں زندگی قیدیوں کی سی تھی۔ وہ اس اپارٹمنٹ میں ایک دفعہ داخل ہونے کے بعد یہاں آنے پر ہی باہر نکلی تھی۔ اس کی سوچ، اس کے خیالات سب کچھ ان چار کمروں تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ان چھ ساڑھے چھ ماہ میں اس نے سعد کے علاوہ صرف ان لوگوں کے چہرے دیکھے تھے جو ٹی وی سکرین پر نظر آتے تھے۔ یہاں حالات مختلف تھے، وہ تازہ ہوا میں سانس لے سکتی تھی۔ گھر سے باہر نکل کر گھوم پھر سکتی تھی۔ مسز جوزف اس کے ساتھ تھیں اور وہ خاصی باتونی اور خوش گفتار خاتون تھیں۔ وہ اسے ان دنوں کی باتیں بتاتی تھیں جب وہ اسلام آباد میں رہتی تھیں۔

''سعد کے والدان دنوں اسلام آباد میں تعینات تھے، سعد ساتویں گریڈ کا طالب علم تھا ان دنوں،

یہ بہت اچھا، بہت نیک اطوار لڑکا تھا۔ یہ باقی بچوں سے بہت مختلف تھا۔ بہت مختلف۔'' انہوں نے اسے بتایا تھا۔ ''مجھے ہمیشہ ہی سے سعد..... بہت پیارا لگتا تھا اور میری اس کے ساتھ بہت اچھی ایسوسی ایشن تھی۔ گریڈ سات سے اے لیولز تک یہ لوگ وہاں رہے اور اس کے بعد میں بھی وہاں سے واپس آ گئی۔ مگر سعد اکثر مجھ سے بات کرتا رہتا تھا۔ دو مرتبہ یہاں آیا اور دونوں مرتبہ مجھ سے ملا بھی۔ ابھی کچھ دن پہلے اس نے مجھ سے رابطہ کیا اور تمہارے بارے میں بتایا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں تو ادھر قصبہ میں رہتی ہوں۔ اگر تم یہاں اسے لے کر آنا چاہو تو خوش آمدید۔ وہ بولا یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ میں اس کو کسی بڑے شہر میں رکھنا بھی نہیں چاہتا۔ میرے اپنے لیے یہ ایک دلچسپ تجربہ ہے۔ ایک ماں بننے والی عورت کی خدمت کرنا۔ یہ بہت اچھا لگ رہا ہے۔'' وہ مختلف کام کرتے کرتے اسے بتاتیں۔ کبھی وہ اس کی گاڑی پر ضروری چیزیں لینے جاتیں تو اسے بھی ساتھ لے جاتیں۔

افروز نے قدرتی مناظر میں گھرا وہ خوبصورت علاقہ دیکھا۔ وہاں فارم ہاؤسز تھے اور پرانی طرز پر بنے بے شمار گھر۔

''ادھر پاکستان میں بھی شمالی علاقے، پہاڑی علاقے اسی طرح کے مناظر سے بھرے ہیں۔ میں نے وہ سب علاقے دیکھ رکھے ہیں۔ چترال، گلگت، سوات، اسکردو مگر وہاں سہولتیں میسر نہیں ہیں۔ یہاں عام آدمی کو بھی زندگی کی ہر بنیادی سہولت میسر ہے۔ زندگی کے معیار میں، کوالٹی میں بہت فرق ہے۔'' باتونی مسز جوزف کی کمنٹری جاری رہتی۔

''تم لیک ڈسٹرکٹ دیکھو گی۔ جہاں ورڈز ورتھ پیدا ہوا، اس کی قبر بھی وہیں ہے۔'' ایک روز جب دنوں بعد چمکتی دھوپ نکلی تھی مسز جوزف نے اسے آفر کی۔ افروز پر ان دنوں جی بھر کر سستی چھائی تھی۔ وہ خود سے، اردگرد کی ہر شے سے سخت بے زار تھی۔ اسے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی اور اگر کبھی آنکھ لگتی تو اسے ڈراؤنے خواب نظر آتے تھے۔

''تمہاری صحت بہتر ہونے کے بجائے خراب ہو رہی ہے، سعد دیکھے گا تو ناراض ہو گا، وہ مجھے تمہاری صحت کے بارے میں خاص طور سے ہدایت کر کے گیا تھا۔'' اس کی بے زاری دیکھ کر مسز جوزف کو دوسرا خیال سوجھا۔

''وہ واپس آئے گا تو کچھ کہے گا نا؟'' وہ جب سے گیا تھا اس نے ان لوگوں سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ افروز کو رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ وہ اسے اپنے سر سے اتار کر پھینک گیا تھا اور اب وہ عمر بھر یونہی اس اجنبی وطن میں بھٹکتی رہے گی۔ وہ اپنے حالات اور خدشات پر قابو پانے میں ناکام ہو رہی تھی۔

''جیاء (ضیاء) صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ میں نے پہلے یہاں ان کے ہاں نوکری کی، جب

وہ یہاں ہائی کمیشن میں تھے پھر ان کے خاندان کے ساتھ پاکستان چلی گئی۔ وہاں میں نے ایک اعلیٰ درجے کا وقت گزارا مگر پھر بھی مجھے ہوم، یاد آتا تھا۔ انسان کہیں بھی چلا جائے اسے، ہوم کبھی نہیں بھولتا تمہیں بھی شاید ہوم سکنس ہوتی ہے جب ہی تم یوں بے زار ہو۔'' مسز جوزف نے ایک اور خیال ظاہر کیا، افروز ان کی کسی بات کا جواب نہیں دے پا رہی تھی، وہ ان کے سامنے بیٹھی خالی نظروں سے انہیں سرعت سے ٹماٹر کی چٹنی اور سیب کا مربہ بناتے دیکھ رہی تھی۔ ایک طرف اوون میں انہوں نے سیب کی چھوٹی چھوٹی پائیز بیک کرنے کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ ساتھ ساتھ وہ ایک بڑی چھری سے بیف کے پتلے پارچے کاٹنے میں مصروف تھیں۔

''وہاں پاکستان میں متوسط طبقے کی اس عمر کی عورتیں کوئی کام نہیں کرتیں، صرف اللہ اللہ کرتی ہیں۔'' اس نے سوچا اور بہت دنوں بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ ابھری۔

دوپہر کے کھانے کے بعد مسز جوزف کے ساتھ وہ گاڑی میں باہر نکلی اور پہلی مرتبہ اس نے اردگرد کے منظر غور سے دیکھے۔ وہ درختوں کے اس جھنڈ کے قریب سے بھی گزریں، جہاں اس رات انگریز بوڑھے مستی میں مصروف تھے۔ وہاں افروز کو سعد کا ہیولہ بے ترتیب دھن پر ہلتا ہوا نظر آیا۔ ہولا لا، لا لا، ہو ہو اس کے کان میں آواز گونجی۔

''بیئر، سردی کی شدت کو کم کرتی ہے۔'' پھر اسے اس کی کہی بات یاد آئی۔

''مجھے یہاں چھوڑ کر وہ وہاں اپنی پسند کی زندگی گزار رہا ہوگا، اب تو غالباً اس نے نباہ کا تردد بھی ختم کر دیا۔'' اس قصبے میں گھومتے ہوئے اسے وہاں چھائی تنہائی اور اداسی شدت سے محسوس ہوئی۔ مسز جوزف نے اسے Dove Cottage کی عمارت دکھائی جہاں ورڈز ورتھ نے اپنی زندگی گزاری تھی اور وہ ویران قبرستان بھی جس میں ورڈز ورتھ ابدی نیند سو رہا تھا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ اتنی تاریخی جگہیں دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتی اور اسے فخر بھی محسوس ہوتا۔ مگر اس روز اس نے یہ جگہیں محض دیکھی تھیں۔ اسے ورڈز ورتھ کی ڈیفوڈل کتنی پسند تھی اسے یہ بھی واپس آ کر یاد آیا۔ گھر واپسی پر انہیں باؤنڈری پیچ کے اندر کرسی پر بیٹھا ایک نوجوان نظر آیا۔

''بوبی! مائی ڈارلنگ۔'' مسز جوزف اس لڑکے کو دیکھ کر چلائیں۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مسز جوزف سے گلے مل رہا تھا۔ ''تم کب آئے بغیر اطلاع کے، تمہیں آنٹ باربرا (مسز جوزف) کیسے یاد آ گئیں۔'' مسز جوزف بچوں کی سی مسرت کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔

''یہ کون؟'' وہ اپنے متعلق کچھ بتا کر افروز کی طرف دیکھنے لگا۔

''یہ افروز ہے سعد کی پارٹنر۔'' افروز کے دل پر ایک اور چھری چلی۔ انہوں نے اسے سعد کی بیوی کی

حیثیت سے متعارف کیوں نہیں کروایا تھا شاید انہیں بتایا ہی یہ گیا تھا۔

''اوہ، سعد۔'' وہ نوجوان مسکرایا اور اس نے افروز کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ افروز نے اپنے گرد لپٹی شال کو مزید لپیٹ لیا۔

''سعد کہاں ہے؟'' اس نے مسز جوزف سے پوچھا۔ وہ اسے سعد کے متعلق بتانے لگیں۔

''اوہ میں بھول ہی گئی۔'' پھر انہیں یاد آیا ''افروز! میں تمہیں بتانا بھول گئی۔'' اب تک وہ انگلش میں بات کر رہی تھیں۔ مگر افروز سے اردو میں مخاطب ہوئیں۔

''یہ بوبی ہے، عبید الرحمٰن، ہے نا!'' انہوں نے اس کا نام بدقت پورا کیا اور پھر اس کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگیں۔ یہ ضیاء صاحب کے بھائی کا بیٹا ہے۔ ادھر برمنگھم ہی میں رہتا ہے۔ اس کا اپنا گیرج ہے، بڑا شاندار کام ہے اس کا۔ کبھی کبھی ملنے ادھر آ جاتا ہے۔'' وہ بتا رہی تھیں۔

عبید الرحمٰن عرف بوبی کی آمد ہنگامہ خیز ثابت ہوئی تھی۔ وہ متحرک اور زندگی سے بھرپور لڑکا تھا اور یہاں ویک اینڈ منانے آیا تھا۔ اس شام تک اس نے افروز سے سوال پوچھ ڈالے۔ گو اس کی اردو کمزور تھی مگر وہ دانستہ اس سے اردو میں بات کر رہا تھا۔

''سعد نے تم سے شادی کی یا تمہیں ایسے ہی رکھا ہوا ہے؟'' اس نے وہ ازلی و ابدی منحوس سوال کیا تو افروز کا دل ایک مرتبہ پھر مر جانے کو چاہنے لگا۔ ''وہ حرم پالتے ہیں کیا؟''

اس نے درشتی سے جواب دیا۔ اس کی بات سن کر قہقہہ لگا کر ہنسا۔

''حرم پال کر ابا جان سے جوتے کھانے ہیں اس نے میرا خیال ہے کہ اس نے تمہارے متعلق بھی اپنے والدین کو نہیں بتایا ہوگا۔'' افروز نے اس بات کا جواب وہی دیا جو سچ تھا۔

''ابھی وہ مقابلے کے امتحان کی تیاری کر رہا ہے۔ وہ جتنا جینئس ہے یقیناً کوئی معرکہ کرے گا لیکن جب تک یہ معرکہ ہو نہیں جاتا اس وقت تک وہ وہ اپنے والد پر مکمل انحصار کرے گا۔ ویسے اس کا بینک بیلنس قابل رشک ہے اور جو سہولتیں اس کو میسر ہیں وہ پاکستان میں وی آئی پیز ہی کو میسر ہوتی ہیں۔ پاکستان کی خصوصاً اور ساؤتھ ایشیا کی عموماً بیوروکریسی زندہ باد۔ سعد کے والد آج کل غالباً فیڈرل فنانس سیکرٹری ہیں اپنے ملک کے۔'' یہ افروز کے لیے نیا انکشاف تھا اس رات تک وہ افروز سے خاصا بے تکلف ہو چکا تھا۔ اس نے اسے اپنے متعلق بتایا تھا۔ اس کے والد فوت ہو چکے تھے اور والدہ جو انگریز تھیں دوسری شادی کر چکی تھیں۔ خود اس نے دو ناکام شادیاں کی تھیں اور اب تنہا زندگی گزار رہا تھا۔ ''زندگی کو انجوائے کرنا چاہیے، گھٹ گھٹ کر زندگی گزارنا گناہ ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا ''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ احمق تمہیں یہاں کیوں چھوڑ گیا ہے؟''

''اپنے باپ کی جوتیوں سے بچنے کے لیے۔'' پھر اس نے خود ہی جواب دیا۔ افروز اس اسرار کو ابھی تک خود جان نہ پائی تھی اسے کیا بتاتی۔

بوبی سنڈے کی شام کو واپس چلا گیا۔ اور اتوار کی صبح اس نے ان دونوں کو خوب گھمایا پھرایا تھا۔ وہ انہیں لنکا سٹر لے گیا تھا۔ اس نے خود بھی شاپنگ کی تھی اور ان دونوں کو گفٹس لے کر دیے تھے۔ افروز کو وہ دو دن عرصے بعد ایسے لگے جیسے اس نے زندوں کی طرح گزارے تھے۔ بوبی کے جانے کے فوراً بعد ہی پاکستان سے سعد کا فون آ گیا۔

''میں اپنے امتحان میں مصروف تھا۔ اس لیے فون نہ کر سکا، تم ٹھیک ہو نا؟'' وہ کہہ رہا تھا۔

''تم یہاں کب آؤ گے؟'' افروز نے سوال کیا۔

''معلوم نہیں۔ شاید کچھ عرصہ بعد آؤں شاید زیادہ عرصہ لگے۔'' اس نے مبہم سا جواب دیا۔ ''تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، کسی چیز کی کمی تو نہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

افروز نے نفی میں جواب دیا پھر وہ مسز جوزف سے بات کرتا رہا افروز پر بوبی کی کمپنی کا اثر تھا اور وہ اس اثر کو خود پر قائم رکھنا چاہتی تھی۔ بہت عرصے کے بعد اس نے زندگی کی خوبصورتی کو محسوس کیا تھا اور وہ اسے محسوس کرنے کی خواہش کرنے لگی تھی۔

☆

وہ رویندر سکسینہ تھا، برطانیہ نژاد ہندو۔ اس کی زندگی انگلینڈ میں گزری تھی۔ اسے اس کے والدین سے اس کی لاولد بوا (پھوپھی) نے گود لے لیا تھا جو لندن میں رہتی تھیں۔ بوا کٹر ہندوستانی تھیں اور انہوں نے رویندر سکسینہ کی پرورش بھی روایتی انداز میں کی تھی۔ رویندر سکسینہ کو تمام عمر اس ملک میں گزارنے کے باوجود اپنے ملک کی ثقافت اور تہذیب سے خوب واقفیت تھی۔ سیاحت اس کا شوق تھا اور کہانیاں لکھنا اس کا مشغلہ۔ اس کی بوا نے جو مرتے وقت اس کے لیے چھوڑا تھا وہ اکیلے اس کے لیے کافی تھا۔ اس نے اس پیسے کو مختلف جگہوں پر انویسٹ کر رکھا تھا۔ خود وہ سیلانی طبیعت کا آدمی تھا ٹک کر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ جو بھی آمدنی ہوتی سیر و سیاحت میں اڑا دیتا اور اپنی سیاحت سے واپسی پر اس کے پاس اتنا مواد اکٹھا ہو چکا ہوتا کہ وہ دو تین کہانیاں لکھ کر انڈیا بھجوا دیتا جہاں لیڈنگ میگزینز میں اس کی کہانیاں فوراً لگ جاتی تھیں۔ وہ انڈین نوجوان نسل کا مقبول لکھاری بنتا جا رہا تھا۔

یہ بھی اتفاق کی بات تھی کہ پچھلے کچھ عرصے سے رویندر سکسینہ کو احساس ہو رہا تھا کہ دنیا میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات میں یکسانیت آتی جا رہی تھی اور اس کی لکھی کہانیوں میں بھی تنوع ختم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ کسی نئے موضوع کسی نئی کہانی کی تلاش میں تھا۔ اور اس کے لیے اس نے اردگرد کے کئی یورپین ملکوں کا سیر کا

ارادہ کر رکھا تھا۔ فرانس، اٹلی، سپین، ہالینڈ وہ ہر جگہ گھوم آیا تھا اور اس نے اپنے مشاہدات ترتیب دے کر شائع ہونے کے لیے بھجوا دیئے تھے۔ مگر ایک انوکھی کہانی اس کو اب بھی نہیں ملی تھی۔

ان دنوں وہ لیک ڈسٹرکٹ کی تاریخی جھیل دیکھنے آیا ہوا تھا۔ اسے ہمیشہ سے شور وغل اور رنگ ونور سے دور یہ علاقہ بہت پسند تھا۔ وہ اس علاقے میں سارا دن گھومتا پھرتا رہتا تھا اور رات وہیں کہیں کیمپنگ میں گزار لیتا تھا۔ ہر روز اس کا خیال تقویت پکڑتا جاتا کہ دنیا میں کہانی لکھنے کے لیے موضوعات کی کمی ہوتی جا رہی ہے اور اب اسے اصل کے بجائے گھڑی ہوئی کہانیاں لکھنا پڑیں گی۔

پھر ایک روز گراس میر کے قصبے میں درختوں کے اس جھنڈ میں رکھے بینچ پر اس کی ملاقات اتفاقاً اس لڑکی سے ہوگئی۔ جس نے اسے اپنا نام جہاں افروز بتایا تھا۔ وہ لڑکی ماں بننے والی تھی اور خاصی خاموش طبع تھی۔ وہ اس لڑکی پر چھائی سوگواریت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ پھر وہ اسے روزانہ وہاں بیٹھی ملنے لگی۔ اور رویندر سکسینہ سے گفتگو بھی کرنے لگی۔ اس نے نجانے کیا سوچ کر خود پر گزرے واقعات بھی اسے سنا دیئے تھے۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اتنی آزردہ کیوں ہو جبکہ قدرت نے تو تمہارے لیے بہت اچھا انتظام کیا ہے۔'' اس سفید ہوتے بالوں اور جھریاں پڑتے چہرے والے شخص کی یہ بات افروز کے لیے تعجب خیز تھی۔

''میں ان معاملات کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں، ادھر انڈیا میں نیپال میں اور بنگلہ دیش میں لڑکیوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح بیچ دیا جاتا ہے، ان کی عزتوں کے سودے سرعام کیے جاتے ہیں۔ ان کی عزتوں سے کھیلنا امیر زادوں کے لیے آئے روز کا کھیل ہے۔ وہاں ہی کیا دیکھو ادھر ترقی یافتہ مغرب کی طرف دیکھو، ہر دوسرے سیکنڈ میں ایک عورت ریپ ہوتی ہے مگر کوئی قانون نہیں ہے کوئی پکڑا نہیں جاتا ہے، پھر بھی یہ مغرب کا میڈیا ترقی پذیر ملکوں میں ہونے والے ایسے واقعات پر بھونپو بجاتا رہتا ہے۔ خدا کی اس دنیا میں قانون اندھے ہو چکے ہیں، تم تو بہت خوش قسمت ہو جو ایسے نیک دل آدمی سے ٹکرا گئیں۔ جس نے اگر غلطی کی تو اس کا اتنا بڑا کفارہ بھی ادا کر دیا۔ تم یہاں ہو اور آزاد ہو، تمہیں جو سہولتیں میسر ہیں وہ کسی بھی اے گریڈ شہری کو ایشیا میں میسر ہوتی ہیں، پھر رونا کس بات کا ہے۔'' روی نے پائپ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

''رونا کس بات کا ہے، رونا کس بات کا ہے؟'' افروز کچھ دیر سوچتی رہی۔

''رونا خودی اور خود اعتمادی کی موت کا ہے، رونا اپنوں سے بچھڑ جانے کا ہے، رونا اپنی زندگی پر سے اپنا اختیار ختم ہو جانے کا ہے۔''

''کس کو اختیار حاصل ہوتا ہے اپنی زندگی پر۔'' رویندر سکسینہ نے متانت سے کہا۔

''ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں، جو کچھ بھی ہمارے ساتھ ہوتا ہے اس کا اختیار ایک غیر مرئی طاقت کے ہاتھ میں ہے۔ ہم، ہمارے ارادے، ہماری خواہشات، ہماری سوچیں سب اس کے اختیار میں ہیں۔ پھر اختیار

کا رونا کیسا۔ رہا سوال خودی اور خود اعتمادی کا تو وہ تو تم نے خود اپنے ہاتھ سے جانے دیئے۔ قدرت نے تو تمہیں اتنا عمدہ موقع عطا کیا خودی اور انا اور خود اعتمادی کو بحال کرنے کا، وہ شخص جو تمہاری عزت لوٹنے کا مرتکب ہوا وہی تمہاری عزت بحال کرنے اور کیے رکھنے کے لیے اتنے بڑے بڑے خطرے مول لیتا رہا۔ اس کو اس نکاح جو اس نے تم سے کیا اور اپنی ذاتی زندگی کی مجبوریوں کے درمیان بیلنس قائم رکھنے میں کیا مشکل پیش نہیں آتی ہوگی۔ کیا اسے کسی الزام کا سامنا ہو جانے کا ڈر نہ ہوگا۔ لیکن کیسا ہمت والا شخص ہے وہ اور اس نے جو کہا اسے نبھایا بھی، وہ چاہتا تو تمہاری دوست کے واویلے پر کان تک نہ دھرتا اور اپنی آزادانہ زندگی جیے جاتا۔ تمہیں تو قدرت کے اس انتظام پر فخر سے سر اٹھا کر جینا چاہیے تمہارے منہ سے خودی اور خود اعتمادی کی موت ہو جانے کا سن کر مجھے حیرت ہوئی۔''

''میرے اپنے سارے مجھ سے چھوٹ گئے۔'' افروز سسکنے لگی۔

''ذرا اپنے دل سے پوچھو، کیا وہ تمہارے اپنے تھے میرے خیال میں تو اس لڑکے سے زیادہ وہ لوگ تمہاری زندگی تباہ کر دینے کے موجب بننے والے تھے۔ اور پھر ایک خاص عرصے کے بعد جب تمہیں اس لڑکے نے زندگی کی رونقیں میں دوبارہ سے رواں کیا تو انہیں تکلیف ہونے لگی وہ تمہاری بربادی کی داستان سننا چاہتے تھے، تمہاری آبادی کی خبریں انہیں پسند کہاں آئی ہوں گی۔''

''مگر وہ جس نے آباد کیا وہ بھی تو دھوکے باز ہے۔ اس نے جتنے کاغذ مجھے دکھائے وہ سب جھوٹے تھے۔ وہ محض وقتی طور پر مجھے خاموش کرانا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے عالیہ سے ملنے سے بھی منع کر دیا۔''

''عالیہ کون؟''

''عالیہ چغتائی، وہی لڑکی جس نے زندگی میں میری باعزت واپسی کے لیے وہ تمام پاپڑ بیلے۔'' افروز نے اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے کہا۔ ''اس نے ایک مرتبہ بھی اس شادی کو کسی کے سامنے ڈکلیئر نہیں کیا اور جب لوگوں کو پتہ چلنے لگا تو مجھے یہاں لا کر پھینک دیا۔ اس ویرانے میں۔''

''تم اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھو تو تمہیں علم ہوگا کہ اس نے جو کچھ بھی کیا محض تمہارے بھلے کے لیے کیا۔ نکاح، گھر، تحفظ، تمہاری دوست سے ملاقات پر پابندی اور تمہاری یہاں موجودگی سب تمہاری خاطر ہوا سب کچھ۔ اگر وہ تمہیں یونہی در بدر ہونے کے لیے چھوڑ دیتا، اگر وہ تمہاری پروانہ کرتا، تو تم کیا بگاڑ لیتیں اس کا، معاشرہ، لوگ والدین سب تو تمہیں دھتکار ہی چکے تھے، گھر والے تو تمہارے وہی تھے نا جو اتنے عرصے کے بعد ریوالور لے کر تمہیں ڈھونڈتے قتل کرنے چلے آئے اس پرانی غیرت کا نعرہ لگاتے ہوئے۔ اس سے پہلے وہ کہاں تھے اور تم بتاؤ جب وہ تمہیں مارنے آئے تو تم نے اپنے بچاؤ کے لیے اس لڑکے کو کیوں بلایا، وہ جو تمہارے بقول قابل نفرت تھا اور ذرا سچ بولو تو بتاؤ کہ کیا تمہیں اب اس کی غیر موجودگی کھٹکتی نہیں، کیا

تمہیں وہ یاد نہیں آتا؟''

''ہولا لا، لا لا، ہو ہو۔'' افروز نے اپنے اردگرد ایک نظر ڈالی اور ایک آواز کی بازگشت اس کے اردگرد پھیل گئی۔

''وہ ایک اچھا انسان ہرگز نہیں ہے۔ وہ شراب پیتا ہے اور لڑکیوں سے دوستی رکھتا ہے۔'' اس نے ایک اور وجہ پیش کی۔

''تمہارے پاس کیا گارنٹی ہے کہ وہ جسے تمہارے والدین نے تمہارے لیے پسند کیا تھا وہ ایسا نہیں تھا یا کوئی بھی جو تمہاری زندگی میں تمہارا پارٹنر بن کر آتا وہ ایسا نہ ہوتا۔ ہم خدا کے ارادوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔'' روی سکسینہ کو خود اپنی گفتگو پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس نے اس سے پہلے ایسی دلائل سے بھرپور نصیحت کسی کو نہیں کی تھی۔

''اس نے دل سے اس تعلق کو ایک دن بھی قبول نہیں کیا۔ وہ محض اپنی غلطی کے کفارے کو نباہ رہا ہے اور اس بات کا کئی بار وہ خود اعتراف کر چکا ہے۔'' افروز نے دل میں انی کی طرح گڑی وہ بات بھی اگل دی، جو ہمیشہ اسے تکلیف دیتی تھی۔

''وہ کیا کہے۔ کیا تم اسے اتنا کہنے کا حق بھی نہیں دو گی، یقیناً لائف پارٹنر کے طور پر اس نے تم جیسی لڑکی کے متعلق نہیں سوچا ہوگا۔ یقیناً اس کے بھی کچھ آئیڈیلز ہوں گے۔ یقیناً زندگی کے نقشے مین اور طرح کے رنگ بھرنے کے بارے میں سوچا ہوگا۔ مگر یہ بتاؤ اس بات کا واویلا اس نے کتنی مرتبہ تمہارے سامنے کیا۔ کتنی مرتبہ اس نے تمہارے سامنے اپنا کوئی احسان جتایا؟'' رویندر جذباتی ہو کر ایک ایسے شخص کی حمایت میں بول رہا تھا جسے اس نے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا۔

''اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی زندگی اپنی مرضی کے مطابق گزارے گا، مجھ سے اس کا تعلق محض نباہ کا ہے۔'' افروز نے اس کی بات سے متاثر ہوئے بغیر کہا۔

''تو ہے نا، تم کیا کر لو گی اگر وہ نباہ ہے گا بھی نہیں تو، ذرا اس زندگی کا تصور کرو جس میں اس کا یہ نباہ تمہارے ساتھ نہ ہوگا، جس میں وہ تمہیں تمہارے سارے اختیار واپس سونپ کر آزاد کر دے گا، تمہاری خودی اور خودداری سمیت۔'' رویندر سکسینہ نے اپنا تھیلا اٹھا کر اس کی ڈوریاں کستے ہوئے کہا ''جو نہیں ہے، تم اس کے ماتم میں مشغول ہو جو ہے اس کا شکر کب ادا کرو گی؟'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔

☆

''یہ کوئی احسان نہیں ہے اس کا تم پر، جو اسٹیٹس اس کا اس ملک میں ہے، وہ سارا کا سارا جاتا رہتا اگر اس سیکنڈل کی بھنک بھی کسی میڈیا رپورٹر کے کان میں پڑ جاتی۔ تم تو صورتحال کو سمجھتی ہی نہیں، ورنہ تم اسے

بری طرح ایکسپلائٹ کر سکتی تھیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ جب چاہا پیسے کے بل پر کسی کی عزت لوٹ لی جائے اور جب چاہا اس عزت کی بحالی کا اعلان کر کے نیکی اور احسان کے جھنڈے بلند کر لیے جائیں۔'' دوسری طرف بوبی تھا جسے سعد کے سارے عمل میں بدنیتی اور ایکسپلائٹیشن نظر آ رہی تھی۔

''احمق تھی تمہاری دوست جو سعد کی اس نکاح والی آفر کے دھوکے میں آ گئی تھوڑا انتظار کرتی وہ این جی او والے یقیناً اس سلسلے میں کوئی قدم اٹھاتے۔ اسی بات کے خوف نے ہی تو سعد کو افراتفری میں یہ نکاح کر لینے پہ مجبور کر دیا اور پھر نکاح کرنے کے بعد کیا کر رہا ہے تمہارے ساتھ، کبھی یہاں چھپا، کبھی وہاں چھپا، چوروں جیسی زندگی جیسے سارا گناہ تمہارا ہے، خود تو وہ ایک آزاد مرے دار زندگی گزار رہا ہے۔ عیش کرتا پھر رہا ہے۔'' بوبی کی باتیں جہاں افروز کو ڈبل مائنڈڈ کر دیتی تھیں۔

☆

''پھر ایک کہر میں لپٹی صبح کو اس نے اس نرسنگ ہوم میں ایک صحت مند بچے کو جنم دیا۔ مسز جوزف اس کے ساتھ تھیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس بچے کی پیدائش پر کیا سوچے۔ وہ گناہ کی پیداوار تھا یا نباہ کی۔ اسے خوش ہونا چاہیے تھا یا خوب رونا چاہیے تھا۔

''میں نے سعد کو اطلاع کر دی ہے، وہ ویسے بھی کل صبح کی فلائٹ سے آ رہا تھا۔ اسے اس وقت کے بارے میں بہت فکر تھی۔'' مسز جوزف نے اسے بتایا۔

ایک دن اس نرسنگ ہوم میں گزار کر وہ واپس گھر آ گئی اور اسی دوپہر سعد وہاں پہنچ گیا۔ وہ پہلے سے زیادہ صحت مند اور سرخ و سفید نظر آ رہا تھا۔ اس نے انتہائی محبت اور خوشی سے بچے کو اپنی گود میں لے لیا۔ وہ بچہ جسے افروز نے ابھی تک ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔

''بے بی بالکل تمہاری طرح ہے سعد!'' مسز جوزف خوشی سے کہہ رہی تھیں۔ افروز نے اس کا ردعمل دیکھا وہ مسکراتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔

''یہ ان لمحات کا عکس اپنے چہرے پر ساتھ لے کر آیا ہے تاکہ مجھے یاد دلاتا رہے کہ میری غلطی ایسی تھی جس سے پیچھا چھڑانا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔'' بعد میں افروز کے پاس تنہائی میں اس نے کہا۔

''یہ قدرت کی لاٹھی ہے جو بے آواز ہوتی ہے۔'' افروز نے درشت لہجے میں کہا۔

''میں اس بات سے انکار تو نہیں کر رہا۔'' اس نے نیچی آواز میں کہا ''اور یہ تم روٹھی کیوں پڑی ہو۔ تمہارا رویہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''تمہیں جس بات کا علم ہے، وہ کیوں پوچھ رہے ہو۔''

''میں مقابلے کے امتحان میں مصروف تھا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ یہ سب جو تمہارے لیے ہو رہا

ہے اسے عمر بھر نبھانے کے لیے مجھے ڈیڈی کے پروں تلے سے نکلنا ہے۔ مجھے خود اپنا اسٹیٹس بنانا ہے۔ یہ اخراجات اب میری ہمت سے باہر ہوئے جا رہے تھے۔'' اس نے سچائی سے اعتراف کیا۔

''تمہارا بینک بیلنس قابل رشک ہے اور جو سہولتیں تمہیں وہاں میسر ہیں، وہ صرف وی آئی پیز کو میسر ہوتی ہیں۔'' افروز نے بوبی کے کہے الفاظ دُہرائے۔

''تو؟'' اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

''تو پھر اخراجات ہمت سے باہر کیسے ہوئے جا رہے ہیں؟''

سعد کو اس کے زہر خند لہجے سے یقیناً تکلیف ہو رہی تھی۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہاری یہاں رہائش کے سلسلے میں مسز جوزف کو کتنی رقم ادا کرتا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس نکاح والے وقت سے لے کر اب تک وہاں لاہور میں تمہاری رہائش اور ضروریات پوری کرنے سے لے کر یہاں آنے کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کی مد میں، میں کیا اور کتنا خرچ کر چکا ہوں؟'' وہ قدرے اونچی آواز میں بولا۔

''یہ تمہارا آپشن تھا۔'' افروز کی یہ بات اس کا دل جلا گئی۔

''ہاں یہ میرا آپشن تھا اور میں نے کبھی اس کی شکایت بھی نہیں کی۔ میں اس آپشن کو نبھانے کے لیے کچھ بھی کر لوں، تم کبھی خوش نہیں ہو گی۔ کیونکہ تم نے خوش ہونا اور شکر گزار ہونا سیکھا ہی نہیں۔''

''تم سبق پڑھاؤ گے مجھے خوش ہونے کے اور شکر گزار ہونے کے؟'' افروز نے اپنے اوپر سے کمبل ہٹا کر بیڈ سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم جو دوسروں کی خوشیاں اور سکھ چھیننے والوں میں سے ہو۔''

''میں سچ کہتا ہوں، تم واقعی سخت ناشکری ہو۔'' سعد نے کرسی کی پشت پر بے بسی سے ہاتھ مارا۔

''میں یہ نہیں چاہتا تھا، کسی قیمت پر بھی نہیں۔'' اس نے کاٹ میں لیٹے بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم نے اس پر اصرار کیا میں نے اصرار کو مان لیا صرف اس لیے کہ شاید تمہارے دل کا سکون میرے اضطرار کو کم کر دے۔ تمہاری دوست نے مجھے بتایا کہ تمہیں روپے پیسے سے زیادہ عزت درکار ہے اور اس کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ میں تم سے نکاح کر لوں۔ میں نے اس صورت کے سامنے بھی سر جھکا دیا محض اس لیے کہ میں تمہارا سکون چھین کر خود بے سکون رہنے سے ڈرتا تھا۔ تم وہاں محفوظ نہیں تھیں، تم نے خود دیکھا۔ میں تمہارا تحفظ چاہتا تھا۔ میں تمہیں یہاں لے آیا تاکہ تم آزاد اور محفوظ زندگی گزار سکو۔ اور یہ سب جو میں نے کیا محض ایسے ہی نہیں ہو گیا۔'' اس نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔ ''اس کے لیے جو میں نے قربان کیا اس کی داستان میں تمہیں کبھی نہیں سناؤں گا کیونکہ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں سمجھتا تھا تمہارے اس اصرار کا جو یہ نتیجہ نکلا ہے۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر بچے کی طرف اشارہ کیا ''تم اس پر ہی خوش ہو جاؤ گی، کیونکہ میں جو یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا میں

اس کا چہرہ دیکھ کر سرتاپا خوشی کی ایک ایسی کیفیت میں گھر گیا ہوں، جس کا بیان مشکل ہے مگر تم تو اس پر بھی خوش نہیں ہو۔ مجھے لگتا ہے کہ تمہیں عادت ہوگئی ہے ہر نئی صورتحال کو ایکسپلائٹ کرنے کی، مجھے جذباتی طور پر بلیک میل کرنے کی، مجھے ایک نئی مشقت میں ڈالنے کی اور میں یہ سب محض اس لیے سہتا آیا ہوں کہ میرے ضمیر پر اپنے کیے کا بوجھ ہے۔ لیکن یہ بوجھ، کب تک بوجھ رہے گا۔ میں آج اس بوجھ سے خود کو آزاد سمجھتا ہوں۔ یہ بچہ میرا بیٹا ہے۔ اس کی والدیت کے خانے میں میرا نام ہے۔ میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے اپنی زندگی کی ان دو حقیقتوں سے۔'' اس نے افروز اور بچے کی طرف اشارہ کیا۔ ''کبھی فرار کا سوچا بھی نہیں ہاں یہ ضرور کہتا ہوں کہ میری زندگی کی کچھ جہتیں اور بھی ہیں میرے والدین میرے اس فعل کے ذمہ دار نہیں تھے، مگر میرے سلسلے میں ان کے کچھ خواب ہیں۔ میں اپنے گھر کا بڑا بیٹا ہوں اس گھر کی کئی خوشیاں مجھ سے وابستہ ہیں۔ میں ان کے سر پر اپنی غلطیاں اور ان کے کفارے مسلط نہیں کر سکتا۔ وہ میرے لیے جو بھی فیصلہ کریں گے مجھے قبول ہوگا۔ مگر زندگی کا دوسرا پہلو تم اور یہ بچہ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ میں نے زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو ساتھ لے کر کیسے چلنا ہے۔''

''تمہیں مبارک ہوں دونوں پہلو اور ان کو ساتھ چلانے کا عزم۔'' افروز اٹھ کر چلائی ''میں تنگ آچکی ہوں فرار کی اس زندگی سے، اس سے چھپو، اس سے چھپو، محدود پیمانے پر زندگی گزارو، ساتھی کی رفاقت کو ترسو، ساتھی بھی وہ جو ہمیشہ غلطی کے کفارے کو نبھانے کی بات کرتا ہے۔ جس نے آج تک دل سے اس رشتے کو تسلیم ہی نہیں کیا۔ مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے۔ اس سے تو بہتر تھا کہ اس روز عزیر اور جہاں آراء مجھے واقعی قتل کر کے چلے جاتے۔ اس زندگی سے تو موت اچھی ہے۔'' وہ چلاتے چلاتے ہانپنے لگی۔ اسے شدید نقاہت محسوس ہو رہی تھی۔ سعد نے آگے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور اس کے کانپتے وجود کو بستر پر لٹا دیا۔

''تم ڈپریشن کا شکار ہو رہی ہو اور تمہیں گمر وری بھی ہے۔'' وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے بولا۔

''افروز! تم نہیں جانتیں، تم بہت سوں سے بہت اچھی زندگی گزار رہی ہو، یہ اور بھی بہتر ہوتی چلے جائے گی۔ تمہاری تمام خواہشات پوری ہوں گی، یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا مگر وہ کچھ سن نہیں پا رہی تھی۔

☆

بچے کی پیدائش کا سن کر بوبی ہوا اس ویک اینڈ پر اچانک آ گیا تھا۔ سعد اسے وہاں دیکھ کر حیران ہوا۔ سعد نے بچے کا نام مومن رکھا تھا بوبی مومن کے لیے کئی چیزیں لایا تھا۔ سعد کو یہ سن کر بھی حیرت ہو رہی تھی کہ وہ اس کے اور افروز کے تعلق کے متعلق سب کچھ جانتا تھا۔ وہ ان دونوں کی بے تکلفی پر بھی حیران تھا۔ افروز نے اس کے سامنے دانستہ بوبی سے زیادہ بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ اس کی ہر بات پر کھلکھلا کر ہنس رہی تھی۔ وہ سعد کا ردعمل دیکھنا چاہتی تھی۔ مگر وہ سنجیدہ اور خاموش تھا۔

''یہ تمہاری دوست عالیہ چغتائی کا فون ہے۔'' وہ کچھ دیر کے لیے باہر نکلا تھا واپسی پر اس نے موبائل افروز کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

''عالیہ۔'' افروز نے دہرایا اور فون کان سے لگالیا۔

''تم کتنی خوش قسمت ہو افروز! تمہیں خدا نے بیٹا بھی دے دیا اور اتنا خیال رکھنے والا شوہر بھی، دیکھ برے دن کتنی جلدی ختم ہو جاتے ہیں۔ میں بہت خوش ہوں افروز میں ہر روز سونے سے پہلے تمہارے لیے دعا کرتی ہوں حالانکہ تم یہاں سے جانے سے پہلے مجھے ملیں تک نہیں۔''

افروز سن رہی تھی مگر جواب نہیں دے رہی تھی۔

''افروز، ہیلو۔'' عالیہ کی آواز آئی ''تم میری آواز سن رہی ہو نا، تم بول کیوں نہیں رہیں، تم نے سعد کو دیکھا، دیکھو، وہ کتنا بدل گیا ہے۔ پچھلے دنوں جب میں اس سے ملی تو میں حیران رہ گئی۔ یہ وہ شخص تو نہیں تھا جو جو مجھے پہلی بار ملا تھا نیٹس کورٹ سے باہر اور تم نے دیکھا وہ نیشنل چیمپئن شپ بھی جیت گیا ہے۔ اور اب دیکھنا اس کا رزلٹ بھی زبردست آئے گا۔ اس نے اپنا راستہ دریافت کرلیا ہے افروز! قسمت نے تمہارے لیے کتنے منفرد اور بلند شخص کو چنا ہے خواہ وہ تم کو کیسے بھی ملا۔''

عالیہ اپنی کہے جارہی تھی۔ مگر افروز اس کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے پائی تھی۔ اس نے فون بند کردیا۔ سعد بڑے غور سے اسے دیکھ رہا تھا اور بوبی مومن کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف تھا۔

''سعد! تم نے افروز کو یہاں کیوں بھیج رکھا ہے۔ اسے لندن میں کیوں نہیں رکھتے۔ یار! تم اس کے ساتھ ظلم کررہے ہو۔'' بوبی نے رات کو کھانا کھاتے ہوئے کہا۔

''اچھا تو یہ تم ہو۔'' سعد نے دل میں سوچا مگر بوبی کی بات کا جواب نہیں دیا۔

''یہ یہاں رہ کر کرے گی بھی کیا، اس بور اور خشک علاقے میں، جس مقصد کے لیے تم نے اسے یہاں رکھا تھا وہ تو پورا ہو گیا اب آگے تمہارے کیا ارادے ہیں؟'' بوبی اسے بولنے پر اکسا رہا تھا ''ادھر آئی سنا ہے تمہارا رشتہ پلوشہ سے طے کررہی ہیں۔ انکل شجاعت کی بیٹی ہے نا پلوشہ، مجھے یاد ہے یہیں لندن سکول آف آرٹ اینڈ ڈیزائن سے پڑھ کر گئی ہے، وہ بہت خوبصورت اور اسٹائلش ہے۔ ایک پرفیکٹ میچ۔ آئی بہت جینئس ہیں۔'' سعد نے سوپ پیتی افروز کو دیکھا، جس کے چہرے کے تاثرات اس کے اندر کی کیفیت کو صاف ظاہر کررہے تھے۔

''مسز جوزف، آپ افروز کو دودھ باقاعدگی سے دے رہی ہیں نا؟'' اس نے کسی بھی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں کیا تھا اور ایک بالکل ہی مختلف بات کی تھی۔ افروز نے سوپ کے پیالے میں چمچ پٹخ دیا اور اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔ مومن کے رونے کی آواز آنے لگی وہ مسز جوزف کی طرف چلی گئی۔

''تم نے دیکھا، وہ کتنی بور ہو چکی ہے یہاں، یار! اسے زندگی سے اتنا دور تو مت کر دو۔ لوگ داشتائیں رکھتے ہیں مگر یوں تو نہیں۔'' بوبی اپنی بات کہنے سے باز نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ فرش پر بیٹھا اپنا جبڑا سہلا رہا تھا۔

''کسی کے معاملے میں بے تکا بولنا تمہاری عادت بنتی جا رہی ہے شاید۔'' سعد اس کے سر پر کھڑا کہہ رہا تھا۔ ''تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ میں کون ہوں اور مجھ پر ایسی باتوں کا کیا اثر ہوتا ہے۔''

''تمہارا شوہر غالباً برا مان گیا۔'' افروز کے وہاں آنے پر بوبی نے اپنا جبڑا سہلاتے ہوئے کہا۔

''جب کوئی انصاف کی بات کرے تو انہیں یونہی برا لگتا ہے۔'' افروز نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''انصاف کیا ہوتا ہے اور بے انصافی کیا چیز ہے۔ اس کا اندازہ تمہیں نہیں ہے، اسی لیے اتنی بڑی بڑی باتیں کر رہی ہو۔ جس دن دونوں کے درمیان فرق پتہ چل گیا سر پکڑ کر روؤ گی۔'' سعد نے سخت لہجے میں کہا۔

☆

سعد کے جانے کے بعد افروز کو قطعی یاد نہیں رہا کہ وہ اسے کیا بتا کر اور کیا سمجھا کر گیا تھا۔ اسے صرف اتنا یاد تھا کہ بوبی نے اس کا رشتہ طے ہونے کی بات کی تھی اور اس نے اس سے انکار نہیں کیا تھا۔ بوبی اسے یہ بھی یاد دلاتا رہا تھا کہ اس کے یورپ کے پچھلے ٹور پر وہ دونوں کن کن قحبہ خانوں میں جاتے رہے تھے اور انہوں نے کتنے جوئے جیتے تھے۔ وہ اسے ان لڑکیوں کے نام بھی یاد دلاتا رہا تھا جن کی رفاقت میں انہوں نے وہ ایک ماہ گزارا تھا۔ وہ اسے پرانی اور نئی شراب کے ذائقوں میں فرق بھی یاد دلاتا رہا تھا۔ یہ سب وہ باتیں تھیں جو افروز کو سعد سے مزید متنفر کر رہی تھیں۔ مگر افروز کو یہ یاد نہیں رہا تھا کہ وہ بوبی کی کسی ایسی بات پر مشتعل نہیں ہوا تھا۔ اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ وہ بوبی کی کس بات پر مشتعل ہوا تھا۔

☆

مومن کو مسز جوزف سنبھالتی تھیں اور خود افروز کبھی ادھر ہی قصبے میں اور کبھی بوبی کے ساتھ قصبے سے باہر گھومنے نکل جاتی تھی۔ اس نے بوبی کے ساتھ ہی لنڈن شہر دیکھا اور اس کے نواحی علاقے بھی۔ اسے عرصے کے بعد رنگ، روشنیاں اور زندگی کی خوبصورتی نظر آئی تھی۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے غم بھولنے لگی تھی۔ اسے بوبی کی رفاقت بھی اچھی لگتی تھی۔ وہ جو ہنستا ہنساتا رہتا تھا۔ اور زندگی کے ایک ایک لمحے سے خوشیاں کشید کرنے کا قائل تھا۔ افروز چوروں کی سی زندگی سے نکل کر آزادی کی زندگی میں سانس لینے لگی تھی۔ اس پر سے گزرے وقت کے اثرات کم ہوتے جا رہے تھے۔

☆

رویندر سکسینہ نے اس لڑکی کو کئی ماہ بعد دیکھا تھا۔ وہ جس لڑکے کے ساتھ ادھر آ رہی تھی، وہ اسے اس کا لائف پارٹنر سمجھا تھا۔ مگر اس لڑکی نے اسے بتایا تھا کہ وہ کوئی اور لڑکا تھا۔ رویندر سکسینہ کو خود بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا وہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ جس کے متعلق اس لڑکی نے اسے اپنی پہلی ملاقات میں بتایا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے چہرے پر مسرت پھوٹتی دیکھی تھی، وہ بات، بات پہ کھلکھلا رہی تھی۔ وہ پہلے اتنی خوش شکل نہیں لگ رہی تھی مگر اس روز اسے اندازہ ہوا کہ وہ اچھی خاصی خوبصورت تھی۔

''اس لڑکی کو شاید زندگی کا یہ رنگ بھا گیا ہے۔ اور وہ لڑکا.....'' اس نے اس کے شوہر کے بارے میں سوچا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

☆

''سعد! تم جلد ادھر آنے کی کوشش کرو۔'' وہ مسز جوزف تھیں جو فون پر سعد سے بات کر رہی تھیں۔

''میں دیکھ رہی ہوں، افروز نے عبادت کرنا چھوڑ دی ہے۔ پہلے میں نے اسے آدھی رات کو اٹھ کر نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ مگر اب وہ کوئی نماز بھی نہیں پڑھتی۔ اسے مومن میں بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بس بوبی کے ساتھ یا تو فون پر گفتگو کرتی رہتی ہے یا پھر وہ آ کر اسے لے جاتا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہے سعد بہت گڑبڑ۔''

''جو گڑبڑ ہونا ہوتی ہے مسز جوزف! اسے ہونے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ سعد کی سنجیدہ آواز مسز جوزف نے سنی۔ ''افروز جن حالات کا شکار ہوئی ہے، ان میں ایسا ہونا ناممکن بھی نہیں ہے۔ آپ فکر مت کریں، میں جلد آنے کی کوشش کروں گا۔''

☆

وہ اتنی جلدی دوبارہ آ سکتا تھا۔ یہ افروز کو اندازہ نہیں تھا۔

''تم کہاں سے آ رہی ہو؟'' سعد نے بوبی کو باہر سے ہی واپس جاتے دیکھ کر پوچھا۔

''میں گھومنے گئی تھی۔ کچھ ضروری چیزیں لینی تھیں۔'' اس نے لاپروائی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ سعد نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر مہارت سے میک اپ کیا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کاجل لگا تھا اور ہونٹوں پر لپ اسٹک بھی سجی تھی۔ اس نے بالوں کو ترشوار رکھا تھا اور شلوار قمیص کی بجائے وہ پینٹ شرٹ میں ملبوس تھی اس کے کندھے پر لیدر کی جیکٹ بھی لٹک رہی تھی۔

''تم اپنے لیے غلط راستہ چن رہی ہو افروز؟'' اس نے اپنا غصہ دباتے ہوئے کہا۔

''میرے راستوں کے غلط اور درست ہونے کا فیصلہ آخر کب تک تم ہی کرتے رہو گے؟'' وہ بپھر کر بولی۔ ''یوں کر لو، ایسے کر لو، ویسے کر لو۔'' میں کوئی الیکٹرانک مشین ہوں جس کا ریموٹ کنٹرول تم اپنے ہاتھ میں لیے پھرتے رہو گے؟''

''جو بھی سمجھ لو۔'' وہ اس کے عین سامنے کھڑے ہوئے بولا۔ ''پہلے تم کیا تھیں اور کیا کرتی تھیں مجھے کوئی سروکار نہیں اس سے، مگر اب تم ایک بچے کی ماں ہو، وہ بچہ جو جیسے بھی سہی میرا بیٹا ہے۔''

''آئی ڈیم کیئر۔'' وہ پاؤں پٹخ کر بولی ''تم تھے اس آفت میں مجھے پھنسانے والے، تم ہی اس آفت کو بھگتو گے، مجھے نفرت ہے۔'' اس کی بات کو سعد کے تھپڑ نے مکمل نہیں ہونے دیا۔ وہ چہرے پر ہاتھ رکھ کر وہیں ساکت کھڑی رہی۔

''تھو۔'' اس نے فرش پر تھوک دیا ''تم مردوں کے پاس ایک ہی ہتھیار ہے ہاتھ اٹھانے کا ہتھیار جو بات تمہارے خلاف مزاج ہوئی اس پر تم نے ہاتھ اٹھا لیا۔ تم تو حقیقی مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے پھر رہے ہو، حقیقی مسلمان ایسے ہوتے ہیں کیا؟''

''نہیں۔'' وہ سخت لہجے میں بولا ''وہ اتنے احمق نہیں ہوتے کہ انسان کی پہچان کیے بغیر زندگیوں کے اہم فیصلے محض خدا کے حضور سرخرو ہونے کے خیال سے کر لیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی کی اور یقیناً عالیہ چغتائی بھی اسی غلطی کا شکار ہوئی۔ تمہارے جیسے لوگ ایسا خلوص اور اتنا خیال قطعی ڈیزرو نہیں کرتے۔''

''تو مت لٹاؤ خلوص اور خیال، کم از کم میں تو اس ہر وقت کی احسان مندی کے اثر سے نکلوں گی۔''

''تم نے جو کہا ہے اس پر اچھی طرح سوچ لینا، پھر بات کریں گے۔'' وہ مومن کو گود میں اٹھا کر باہر نکلتے ہوئے بولا۔

☆

اس کے بعد اس دفعہ آنے کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ مسز جوزف کی کوششوں اور عالیہ کے فونز نے ان دونوں کو ٹھنڈا کر دیا اور وہ اس وعدے کے ساتھ واپس چلا گیا کہ اگلی مرتبہ وہ اسے لندن شفٹ کر دے گا اور زیادہ وقت اس کے ساتھ گزارے گا۔ لیکن اسی دوران اس کا رزلٹ آ گیا اور وہ اکیڈمی چلا گیا۔ اپنے والد کی خواہش کے عین مطابق اسے فارن سروس میں سلیکٹ کر لیا گیا تھا اس نے امتحان میں ٹاپ کیا تھا۔ کچھ وقت ان ہی مصروفیات میں گزر گیا اور اکیڈمی کے بعد وہ اپنی نئی ذمہ داریوں میں سیٹ ہونے کی کوشش میں مصروف رہا۔ اس دوران اس نے جب بھی فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی افروز اسے نہیں ملی۔

''وہ کہتی ہے کہ تم وہاں شادی کر کے بیٹھ چکے ہو اور اب نہیں آؤ گے۔ اس نے اب کئی کئی دن بوبی کے ساتھ گزارنا شروع کر دیئے ہیں۔'' مسز جوزف نے اسے بتایا۔

☆

''میں تنہا رہتا ہوں افروز! سعد کو تمہاری ضرورت نہیں ہے۔ وہ کتنی دیر اپنا وعدہ نبھائے گا یہ عمر بھر کا

معاملہ ہے۔'' بوبی نے افروز سے کہا تھا۔'' اتنے عرصے میں ہماری اچھی خاصی ہم آہنگی ہو چکی ہے۔'' اس سے طلاق لے کر مجھ سے شادی کر لو۔''

''بوبی سے شادی۔'' افروز نے سوچا اور بوبی اور سعد کا موازنہ کیا۔ اس کے دل نے ہر مرتبہ گواہی دی سعد کا پلڑا بھاری تھا۔ وہ اس کے سحر سے چھٹکارا نہیں پا سکتی تھی۔ مگر یہ حقیقت اسے ہضم نہیں ہوتی تھی۔ سعد وہاں کسی اور کے ساتھ زندگی گزارے اور یہاں گنتی کے چند دن اس کے ساتھ وہ عمر بھر معتبر ہو کر رہنے کی خواہش کرتے رہے گی۔

''بوبی۔'' پھر اس نے سوچا۔'' اس میں وہ تمام عادات موجود تھیں جن کی وجہ سے وہ سعد کے متعلق اچھا سوچتے سوچتے اس سے متنفر ہو جاتی تھی۔ پھر فرق کیا تھا شاید اس کی قسمت میں ہی یہ لکھا تھا۔ بوبی کے ساتھ کم از کم وہ چوروں جیسی زندگی تو گزارنے پر مجبور نہ ہو گی۔ وہ علی الاعلان اس سے شادی کرے گا اور اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا کہ وہ اسے پاکستان لے جا کر اس کے گھر والوں سے ملا دے اور شاید اس وقت وہ لوگ بھی سب کچھ بھول چکے ہوں۔

سعد کے رویے اور بوبی کے دکھائے دلفریب خوابوں نے اسے فیصلہ کر لینے پر مجبور کر دیا۔

''مومن کو آپ اپنے پاس رکھیے مسز جوزف! سعد آئے گا تو خود ہی اس کے متعلق فیصلہ کر لے گا۔ اس کو بتا دیجیے گا، میں اس کی طرف سے بھجوائے پیپرز کا اس ایڈریس پر انتظار کروں گی۔'' اس نے بوبی کے گھر کا پتہ مسز جوزف کو پکڑاتے ہوئے کہا۔

وہ مومن کی طرف دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ اس بچے کو ضائع کروانے کا گناہ کرنا نہیں چاہتی تھی اور اب ایک وقت یہ تھا کہ وہ اس بچے کو اپنے لیے رکاوٹ خیال کر رہی تھی۔ حالات کی آزمائش میں وہ شاید ہار گئی تھی۔ اس کی سوچ، اس کے عقائد اس کا ایمان وہ شاید سب کچھ گنوا چکی تھی۔

☆

درختوں کے اس جھنڈ میں چند بچے کھیل رہے تھے اور رویندر سکسینہ کب سے بیٹھا انہیں کھیلتا دیکھ رہا تھا۔ وہ خزاں کا موسم تھا اور درختوں سے پتے جھڑ رہے تھے۔ اس نے سامنے سے ایک نوجوان کو آتے دیکھا۔ وہ ایشیائی خدوخال کا حامل نوجوان گرم لانگ کوٹ میں ملبوس تھا۔ اس نے چمڑے کے لانگ شوز پہن رکھے تھے۔ اس کے گلے میں مفلر تھا اور سر پر گرم ٹوپی۔ وہ آہستہ قدموں سے چلتا رویندر سکسینہ کے سامنے بیٹھ گیا۔

''رویندر سکسینہ۔'' روی نے آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

''سعد ابراہیم۔'' اس نوجوان نے ہلکی آواز میں کہا۔

''اوہ۔'' روی کو کچھ یاد آ گیا۔

''جہاں افروز والا سعد ابراہیم؟'' اس کا مخاطب بری طرح چونک گیا۔

''کہاں ہے وہ؟'' روی نے اس سے یوں پوچھا جیسے روزانہ اس سے ملتا ہو۔

''وہ چلی گئی ہے۔'' سعد نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟''

''پتہ نہیں۔ بس چلی گئی۔ شاید اپنے نئے ساتھی کے پاس۔''

''یہ اس نے بہت بڑی غلطی کی وہ جلد ہی اس غلطی کا انجام بھی دیکھ لے گی۔'' روی نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''آپ!'' سعد نے اس کو یوں تبصرہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''وہ مجھے دو چار مرتبہ ملی تھی اسی جگہ، اس نے مجھے ساری بات بھی سنائی تھی اور میں نے ہمیشہ اس کی باتوں سے تمہیں پہچانا تھا۔ مگر وہ تمہیں تمہارے ساتھ رہ کر بھی پہچان نہ پائی۔''

''میں مذہبی آدمی نہیں ہوں، مجھے خود اپنے مذہب کے متعلق بہت کچھ معلوم نہیں مگر میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص تمہارے جیسی خوبیوں کا حامل ہو، وہ یقیناً خدا کے پسندیدہ لوگوں میں سے ہوتا ہوگا۔'' روی نے خیال ظاہر کیا۔

''معلوم نہیں۔'' سعد نے شانے اچکائے ''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں نے اپنے خدا کو افروز کے توسط سے پہچانا۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ افروز کے ساتھ غیر فطری ٹکراؤ ہوا بھی اسی لیے کہ مجھے اپنے خدا کو پہچاننا تھا۔ میں نے خیر و شر کی حقیقت، انسانیت اور غیر انسانی جبلت، سچ اور جھوٹ، حرام اور حلال سب کا فرق اس واقعے کی وجہ سے جانچا اور خدا کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے کبھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ نماز میں سکون کیسے ملتا ہے یہ میں نے اس کو نماز پڑھتے دیکھتے محسوس کیا۔ نیکی کرنے سے کیا سرور ملتا ہے، یہ بھی افروز سے نکاح کے بعد پتہ چلا۔ وہ جو بے آسرا ہو جاتے ہیں خدا کے حکم سے ان کا آسرا بن جانے میں کیا مزہ ہے یہ بھی میں نے تب ہی جانا۔ نفس پر، غصے پر، مزاج پر کنٹرول کیسے کیا جاتا ہے، یہ بھی اسی دوران مجھ پر انکشاف ہوا اور اب جب میں اپنی منزل کی طرف رواں تھا تو وہ جو میری انگلی پکڑ کر مجھے اس راستے پر لے کر آئی تھی مجھے بیچ راستے میں چھوڑ گئی۔ میں اندھیرے میں تھا جس کی وجہ سے مجھے روشنی کا راستہ نظر آیا وہ کسی اور راستے کی طرف چل پڑی۔ اسے مجھ سے اپنے اختیارات چھین لینے کا گلہ تھا۔ شکایت تھی کہ میں نے اس سے جینے کا حق چھین لیا ہے اور اس کے اچھے برے کے فیصلے میں کرنے لگا ہوں۔ میں نے خدا کو حاضر و ناظر جان کر اس کے تمام اختیارات، تمام حقوق اسے واپس کر دیے ہیں۔ میں زبردستی کا قائل نہ پہلے تھا نہ اب ہوں میرا خدا گواہ ہے کہ میں نے افروز کو بھٹکنے اور خوار ہونے سے بچانے کے لیے یہ سارے فیصلے اور انتظام کیے۔

میں نے اس کی خوشی کا ہر انتظام کرنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی خوشی کے پیمانے بدل گئے۔ مجھے اعتراف ہے کہ پہلے میں اس سے صرف نباہ کر رہا تھا۔ مگر جس روز اس نے مومن کو جنم دیا میں نے سوچ لیا تھا کہ اب مجھے چاہیے کتنی ہی مشکل سے گزرنا پڑے میں افروز کو اپنی زندگی اور اس معاشرے کے سامنے جس میں میں رہتا ہوں پوری عزت و احترام کے ساتھ وہ مقام دلواؤں گا جو اس کا حق ہے اس کے لیے مجھے کچھ وقت درکار تھا۔ مگر وہ انتظار نہ کر سکی۔ اس کے راستے ہی بدل گئے۔ اس کی ترجیحات ہی بدل گئیں۔ مجھے اس سے کوئی شکوہ نہیں ہے وہ اپنے لیے بہتر سوچنے کا حق رکھتی تھی۔''

''معلوم نہیں کون آزمائش میں پڑا اور کون کس آزمائش پر پورا اترا۔ یہ سارے بھید صرف اوپر والا ہی جانتا ہے۔'' رویندر سکسینہ نے کہا۔ ''وہ بتا رہی تھی کہ تم پاکستان میں کسی بڑے عہدے والے آدمی کی بیٹی سے شادی کرنے والے ہو اور وہ لڑکی تمہارے والدین کا انتخاب ہے۔''

''یہ بھی بوبی کی غلط اطلاعات تھیں۔ میں شادی ضرور کروں گا۔ مگر اللہ نے جو راستہ مجھے دکھا دیا ہے اب اپنی زندگی میں نے اس لڑکی کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا ہے جو مومن کے ساتھ مجھے قبول کر لے گی اور میری سوچ کو میری ذات کو، میری تمام خامیوں اور خوبیوں سمیت قبول کر لے گی۔ میری جوائس پر میرے والدین کو کوئی اعتراض نہیں ہے، یہ بھی مقام شکر ہے۔'' سعد ابراہیم نے واپس جانے کے لیے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''اور اس لڑکی کو بھی میرے ماضی پر کوئی اعتراض نہیں۔ اس نے مجھے میرے حال کو دیکھ کر قبول کیا ہے۔''

''وہ لڑکی کون ہے، یقیناً وہ بہت خوش قسمت ہوگی۔'' رویندر سکسینہ نے یونہی سوال کیا۔

''اس کا نام عالیہ چغتائی ہے۔'' سعد نے رک کر جواب دیا اور کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر چل دیا۔ خزاں رسیدہ پتے اس کے قدموں تلے چرمرا رہے تھے۔ روی نے لانگ کوٹ اور لانگ شوز میں ملبوس اس شخص کو جاتے ہوئے دیکھا، اس کی پشت اس کی جانب تھی اور وہ طویل روش پر بکھرے پتوں کو روندتا چلا جا رہا تھا۔ فضاء میں کہر کا دھواں اڑ رہا تھا اور بچوں کے چلے جانے پر شدید خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

''عالیہ چغتائی۔'' روی نے یاد کرنے کی کوشش کی۔ اس کی یادداشت غضب کی تھی۔ ''ہاں وہ لڑکی جس نے افروز کے لیے وہ ساری جدوجہد کی اور جس سے ملنے سے سعد ابراہیم نے اسے منع کر دیا تھا۔'' اسے یاد آ گیا۔ ''واقعات کہاں سے چلتے ہیں اور کہاں ختم ہوتے ہیں۔'' اس نے سوچا اور ان واقعات پر جو اس نے اب تک سنے تھے غور کرنے لگا۔ یکدم اس کے اندر خوشی کی ایک لہر اٹھی۔ اتنے عرصے سے وہ جس انوکھی کہانی کا متلاشی تھا وہ اسے مل گئی تھی۔ اس نے جلدی جلدی اپنا کیمرہ کا بیگ اٹھایا اور اپنے ٹھکانے کی طرف چل دیا۔

جہاں افروز اور سعد ابراہیم کی کہانی کا انجام ویسا نہیں ہوا تھا۔ جیسا ہونا چاہیے تھا۔ مگر اس کہانی میں کسی کی آزمائش کسی کی نجات بن گئی۔

سعد ابراہیم جیسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ یوں غیر متوقع واقعات کی زد میں آکر زندگی کی روش ہر کوئی نہ تو بدلتا ہے نہ ہی یہ ممکن ہے۔ مگر سعد ابراہیم، جہاں افروز کے ساتھ اپنی زیادتی کو اپنی آزمائش تصور کرتے کرتے خود احتسابی میں پڑ گیا۔ اس کی خود احتسابی نے اسے خود شناسی اور خدا شناسی کا موقع عطا کیا، وہ اپنی آزمائش میں سرخرو ہو گیا۔ جہاں افروز بھی ایسی ہی آزمائش کا شکار ہوئی تھی۔ وہ جو خود شناس بھی تھی اور خدا شناس بھی۔ حالات کی زد میں آکر اچھے برے کی تمیز اور واقعات کے تجزیے کی صلاحیت کھو بیٹھی تھی۔ وہ اس آزمائش پر پورا نہ اتر سکی اور دنیا کی دلفریبیوں نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کی آزمائش سعد ابراہیم کی نجات کا ذریعہ بن گئی تھی۔

رویندر سکسینہ کو عرصے سے ایک انوکھی اور اچھوتی کہانی کی تلاش تھی۔ وہ موضوعات کی یکسانیت سے تنگ تھا۔ مگر اس میر کے قصبے میں اس کی آوارہ گردی کے دوران رویندر سکسینہ کو لکھنے کے لیے اچھوتی کہانی مل گئی تھی۔